33

ہفت روزہ

ندائے خلافت

لاہور

30 اگست تا 5 ستمبر 2007ء/16 تا 22 شعبان المعظم 1428ھ

www.tanzeem.org

اس شمارے میں

چودھری افتخار یا جنرل کرامویل

آزادی کے ساٹھ سال: ہم کہاں کھڑے ہیں؟ (2)

حماس پر پابندی اور ہماری دینی سیاسی جماعتیں

ترکی: فوج اور سیاسی جماعتوں کی کشمکش

تحریکی کارکنوں کے لئے لمحۂ فکریہ

جکارتہ کانفرنس اور خلافت کا احیاء

کج سانوں مرن دا شوق وی اے

تنظیم اسلامی کی سرگرمیاں

اسلام اور معاشرہ

اگر ہم اسلامی شریعت کو نافذ کر دیں تو لوگ دل و جان سے قانون کا احترام کریں گے، اوّلاً اس لیے کہ وہ انہیں پورا اجتماعی عدل مہیا کرے گی، سرکشوں اور استحصال کرنے والوں کا راستہ بند کر دے گی، ایک ایسا معاشرہ تیار کرے گی جو لوگوں کی فطرت کو بگاڑنے والی آفات سے پاک ہوگا۔ وہ معاشرہ انہیں اعتماد سے محروم نہ کرے گا اور ان میں اضطراب، ناراضی اور سرکشی پیدا نہیں کرے گا۔ ثانیاً اس لیے کہ وہ ایک مضبوط عقیدے کے ذریعے ان کے دلوں میں پیوست ہوگی۔ اس کی روح ان کی ارواح کی گہرائیوں سے متفق ہوگی۔ اس قانون میں عوام اور اربابِ اقتدار کے درمیان جو تعاون ہوگا وہ اس بنیاد پر نہ ہوگا کہ اس کے ذریعے سے صرف زمینی اقتدار راضی ہوگا، بلکہ اس بنیاد پر ہوگا کہ زمینی اقتدار کے ساتھ ساتھ وہ تعاون آسمانی اقتدار کو بھی راضی کرے گا، اور آسمانی عدالت کو بھی ثابت و قائم کرے گا۔

''اسلام جدید اور تازہ بتازہ معاشرے کو ساتھ لے کر چل سکتا ہے۔'' تو اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ ہم اسلام اور اس کے عقائد و اعمال کو عوام کو پیش آنے والی خواہشات و شہوات کے تابع کر دیں۔ نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ عوام کی چاپلوسی کی خاطر روشن خیالی اور جدیدیت کے نام پر ان پر طاری ہونے والی لذاتِ نفس کے سامنے اسلام کو جھکا دیا جائے۔ یہ ان لوگوں کا طریقہ ہے جنہیں جدید زمانے کے مسلمان کہا جاتا ہے یا جو غلامانہ ذہنیت رکھنے والوں کے دَور میں ''آزاد منش'' کہلاتے ہیں۔

سید قطب شہیدؒ

الھدیٰ (291)

سورۃ الانعام

(آیات: 25 تا 28)

ڈاکٹر اسرار احمد

بسم اللہ الرحمن الرّحیم

﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْــــَٔـوْنَ عَنْهُ ۚ وَاِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ وَلَوْ تَرٰٓي اِذْ وُقِفُوْا عَلَي النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ ﴾

''اور اُن میں بعض ایسے ہیں کہ تمہاری (باتوں کی) طرف کان رکھتے ہیں اور ہم نے اُن کے دلوں پر تو پردے ڈال دیئے ہیں، کہ اُن کو سمجھ نہ سکیں اور کانوں میں ثقل پیدا کر دیا ہے (کہ سُن نہ سکیں)۔ اور اگر یہ تمام نشانیاں بھی دیکھ لیں تب بھی تو اُن پر ایمان نہ لائیں۔ یہاں تک کہ جب تمہارے پاس تم سے بحث کرنے کو آتے ہیں تو جو کافر ہیں کہتے ہیں، یہ (قرآن) اور کچھ بھی نہیں صرف پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ وہ اس سے (اوروں کو بھی) روکتے ہیں اور خود بھی پرے رہتے ہیں۔ مگر (ان باتوں سے) اپنے آپ ہی کو ہلاک کرتے ہیں اور (اس سے) بے خبر ہیں۔ کاش، تم (ان کو اُس وقت) دیکھو جب یہ دوزخ کے کنارے کھڑے کئے جائیں گے اور کہیں گے کہ اے کاش، ہم پھر (دنیا میں) لوٹا دیئے جائیں تا کہ اپنے پروردگار کی آیتوں کی تکذیب نہ کریں اور مومن ہو جائیں۔ ہاں یہ جو کچھ پہلے چھپایا کرتے تھے (آج) اُن پر ظاہر ہو گیا ہے۔ اور اگر یہ (دُنیا میں) لوٹائے بھی جائیں تو جن (کاموں) سے اُن کو منع کیا گیا تھا وہی پھر کرنے لگیں۔ کچھ شک نہیں کہ یہ جھوٹے ہیں۔''

مکے میں بھی وہاں کے ''چودھری'' لوگ رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں آ کر بیٹھتے، اور بڑے دھیان سے آپؐ کی باتیں سنتے، مگر کچھ بھی اثر قبول نہ کرتے۔ اس طرح وہ عام لوگوں کو دھوکہ دیتے۔ لوگ سوچتے کہ جب یہ سردار حضور ﷺ کی باتوں سے متاثر نہیں ہوتے، تو گویا (نعوذ باللہ) محمد ﷺ کی باتیں درست نہیں، ورنہ ہمارے یہ بڑے لوگ آپؐ کی دعوت کو ضرور قبول کر لیتے۔ مدینہ میں علمائے یہود بھی اپنے عوام کو اِس قسم کا تاثر دینے کے لئے حضور ﷺ کی محفل میں بیٹھتے، اور کان لگا کر آپؐ کی باتیں سنتے تھے، مگر مانتے نہ تھے، تا کہ عوام پر یہ اثر ڈالا جا سکے کہ حضور ﷺ کی باتوں میں کچھ بھی نہیں، اگر واقعی کوئی بات ہوتی تو یہ توریت اور انجیل کے عالم ضرور بات سمجھ لیتے۔ حالانکہ بات یہ تھی کہ ہم نے اُن کے دلوں پر پردے ڈال دیئے تھے کہ وہ سمجھ نہیں سکتے تھے، اور ان کے کانوں کے اندر ہم نے بوجھ پیدا کر دیا تھا۔ اگر ان کو ساری نشانیاں دکھا دی جائیں جو یہ مانگ رہے ہیں تو بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ پردے اُن کے حسد اور تکبر کی وجہ سے ڈال دیئے گئے ہیں، یہاں تک کہ وہ آپؐ کے پاس آتے ہیں تو آپؐ سے سوال کرتے ہیں اور یہ کافر کہتے ہیں کہ جو کچھ آپؐ سنا رہے ہیں، یہ تو پرانی باتیں ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ یہود و نصاریٰ سے سن کر پرانے قصے دہرا رہے ہیں۔ وہ ایسے لوگ ہیں کہ دعوت حق سے اوروں کو روکتے بھی ہیں اور خود بھی اس سے دور رہتے ہیں اور اپنے اس رویے سے وہ خود اپنے آپ ہی کو ہلاک کر رہے ہیں، مگر انہیں اس کا احساس نہیں۔

یہاں اس حسرت و یاس کا ذکر ہے جو آخرت میں اُن لوگوں کا مقدر ہو گی جو دنیا کی زندگی میں اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لائے۔ کاش تم دیکھ پاتے (وہ حسرت و یاس) جب یہ کھڑے کئے جائیں گے آگ کے کنارے، پھر یہ کہیں گے اے کاش! کسی طرح ہمیں واپس دنیا میں لوٹا دیا جائے، اگر ایسا ہو جائے تو ہم اپنے رب کی آیات کو نہیں جھٹلائیں گے اور سچے مومن بن جائیں گے، مگر ایسا تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کو پہلے یہ اپنے اندر چھپائے ہوئے تھے اب وہ ظاہر ہو گئی ہے۔ حق تو ان پر پہلے بھی واضح تھا مگر اس وقت حسد، بغض اور تکبر آڑے آ رہا تھا اور یہ قبول حق سے محروم رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بالفرض اگر انہیں دوبارہ لوٹا بھی دیا جائے تو یہ وہی کچھ کریں گے جس سے انہیں روکا جا رہا تھا۔ دنیا میں پھر وہاں کے تقاضے ان کے سامنے آ جائیں گے۔

فرمان نبویؐ

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

مومنین کے لئے استغفار

عَنْ اَبِي الدَّرْدَاءِ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : ((مَنِ اسْتَغْفَرَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ كُلَّ يَوْمٍ سَبْعًا وَعِشْرِيْنَ مَرَّةً كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ يُسْتَجَابُ لَهُمْ وَيُرْزَقُ بِهِمْ اَهْلُ الْاَرْضِ)) (رواہ الطبرانی فی الکبیر)

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو بندہ عام مومنین و مومنات کے لیے ہر روز 27 دفعہ اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت کی دعا کرے گا، وہ اللہ کے اُن مقبول بندوں میں سے ہو جائے گا جن کی دعائیں قبول ہوتی ہیں، اور جن کی برکت سے دنیا والوں کو رزق ملتا ہے۔''

تشریح : اللہ تعالیٰ کو یہ بات بہت ہی محبوب ہے کہ اس کے بندوں کی خدمت و خیر خواہی اور ان کو نفع پہنچانے کی کوشش کی جائے۔ جس طرح مخلوق کے لئے کھانے، کپڑے کے قسم کی زندگی کی ضروریات فراہم کرنا اور ان کو راحت و آرام پہنچانا وغیرہ، اس دنیا میں ان کی خدمت اور نفع رسانی کی صورتیں ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ سے بندوں کے لئے مغفرت اور بخشش کی دعا کرنا بھی اُخروی زندگی کے لحاظ سے ان کی بہت بڑی خدمت اور ان کے ساتھ بہت بڑی نیکی ہے۔

تا خلافت کی بنا، دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

قیام خلافت کا نقیب

ہفت روزہ — لاہور

ندائے خلافت

جلد 16 — 30 اگست تا 5 ستمبر 2007ء — 16 تا 22 شعبان المعظم 1428ء — شمارہ 33

بانی: اقتدار احمد مرحوم
مدیر مسئول: حافظ عاکف سعید
نائب مدیر: محبوب الحق عاجز

مجلس ادارت

سید قاسم محمود۔ ایوب بیگ مرزا
سردار اعوان۔ محمد یونس جنجوعہ
نگران طباعت: شیخ رحیم الدین

پبلشر: محمد سعید اسعد **طابع**: رشید احمد چوہدری
مطبع: مکتبہ جدید پریس، ریلوے روڈ، لاہور

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی:
67۔ اے علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور۔ 54000
فون: 6366638 - 6316638 فیکس: 6271241
E-Mail:markaz@tanzeem.org
مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ 54700
فون: 03-5869501

قیمت فی شمارہ 5 روپے

سالانہ زرِ تعاون
اندرونِ ملک...... 250 روپے
بیرون پاکستان
انڈیا ---------------- (2000 روپے)
یورپ، ایشیا، افریقہ وغیرہ (2500 روپے)
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ (3000 روپے)
ڈرافٹ، منی آرڈر یا پے آرڈر
''مکتبہ خدام القرآن'' کے عنوان سے ارسال کریں
چیک قبول نہیں کیے جاتے

''ادارہ'' کا مضمون نگار حضرات کی رائے سے پورے طور پر متفق ہونا ضروری نہیں

اداریہ
ایوب بیگ مرزا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چودھری افتخار یا جنرل کراموبل

تاریخ گواہ ہے کہ افراد یا معاشرے محض خطاؤں، کوتاہیوں اور گناہوں کی پاداش میں عذاب کی گرفت میں نہیں آتے بلکہ اپنی اس روش پر اصرار، تکرار اور اصلاحی عمل کی مخالفت پر کمربستہ ہونے پر زیرِ عتاب آئے۔ تاریخ ہی کی بات نہیں آفرینش آدم سے ہی یہی سنت اللہ نظر آتی ہے۔ عزازیل نے نافرنی اور خطا کی، پھر بحث و تکرار میں الجھا کہ نار سے پیدا ہونے والا خاک سے پیدا ہونے والے سے افضل ہے، لہٰذا وہ ابلیس ٹھہرا۔ بارگاہِ الٰہی سے ہمیشہ کے لیے رد ہوا اور اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم کی وعید سنا دی گئی۔ خطا آدمؑ سے بھی ہوئی انہیں ریڈ کارڈ دکھا کر جنت سے خارج تو کر دیا گیا لیکن اُنہوں نے خطا پر اصرار کی بجائے توبہ کی، رجوع الی الحق کی خواہش ظاہر کی اللہ رب العزت سے رحم کی درخواست کی تو اُنہیں اور اُن کی اس سنت کی پیروی کرنے والی اُن کی ذرّیت کو جنت کا حقیقی اور دائمی وارث ہونے کی نوید سنا دی گئی۔ فطرت، عقل، منطق ہر شے کا یہی تقاضا ہے خطا اور غلطی سے پاک صرف خالق کی ذات ہو سکتی ہے۔ پیغمبر اور رسول اللہ رب العزت کے خصوصی فضل سے معصوم عن الخطا ہیں، باقی مخلوق کا معاملہ یہ ہے کہ وہ خطا کی پتلی ہے کہا جا سکتا ہے کہ خطا انسان کی سرشت میں شامل ہے۔ اصل امتحان اُس وقت شروع ہوتا ہے جب انسان پر یہ منکشف ہو جائے یا کوئی دوسرا کردے یا حالات نتائج پیدا کر دیں کہ غلطی ہوئی ہے۔ بہادری دلیری یا جرأت مندی یہ نہیں ہے کہ فرد، جماعت یا معاشرہ اپنی غلطی پر ڈٹ جائے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اعتراف خطا حقیقتاً عظمت کی دلیل ہے۔ اس مسئلہ پر ذرا گہرائی سے غور کرنے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ غلطی اور خطا پر ڈھٹائی کا مظاہرہ کرنا بہادری یا دلیری نہیں تکبر اور جہالت جیسی انتہائی خطرناک بیماری کی علامت ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ صدر پرویز مشرف اب تک نہ سمجھے ہوں کہ 12 اکتوبر 1999ء کو اُن سے غلطی ہوئی اور یہ غلطی پاکستانی قوم کے مشترکہ دشمن امریکہ نے ایک مکروہ چال چلتے ہوئے ترغیب و تشویق سے اُن سے کروائی۔ امریکہ کا مسئلہ یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ میں طویل مدت سے اُس نے سیال سونا کی لوٹ مچائی ہوئی ہے، جس کا وہاں کی عوام میں شدید ردعمل ہے، اس لوٹ مار کا سلسلہ کسی وقت منقطع ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ اطلاعات بھی ہیں کہ وہاں تیل کے ذخائر میں بدستور کمی واقع ہو رہی ہے، تیل کی فراوانی کے بغیر عالمی غلبہ قائم نہیں رکھا جا سکے گا۔ لہٰذا اب امریکہ کی نظریں وسطی ایشیا کی نو آزاد مسلم ریاستوں اور بلوچستان میں تیل کے ذخائر پر ہیں اس مقصد کے حصول کے لئے علاقے کے قلب افغانستان پر قبضہ جمانا ضروری تھا۔ ایک ضمنی مسئلہ یہ تھا کہ طالبان کے افغانستان میں اسلامی نظام کی برکات اگر عام ہونا شروع ہو گئیں تو دوسرے اسلامی ممالک بھی اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اُسے آغاز ہی میں اکھاڑ پھینکنا بھی لازم تھا۔ اِن تمام مقاصد کے حصول کے لیے افغانستان پر قبضہ ناگزیر تھا اور یہ پاکستان کے مکمل تعاون سے آسان ہو سکتا تھا۔ اگر افغانستان پر قبضہ کے وقت پاکستان میں جمہوری اور سول حکومت ہوتی تو امریکہ کو دو زبردست مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ایک یہ کہ فوج اور سول حکومت میں امریکہ سے تعاون کرنے کے حوالہ سے اختلاف ہو سکتا تھا جو امریکہ کے لئے نقصان دہ تھا، وہ جانتا تھا کہ جمہوری حکومت کو کئی جھمیلے ہوں گے پارلیمنٹ سے مشورہ، عوام کی ناراضگی کا خطرہ جن سے کل کلاں پھر ووٹ مانگنا ہے وغیرہ وغیرہ جب کہ ایک فوجی آمر سے کچھ بھی راتوں رات منوایا جا سکتا ہے۔ دوسرا یہ کہ بھٹو کے سیکولر دور کے سینئر فوجی ایک ایک کر کے ریٹائر ہو چکے تھے، اب فوج میں وہ کھیپ ٹاپ پر آ چکی تھی جو ضیاء الحق کے اسلامی دور میں پروان چڑھے تھے۔ اِن میں سے صرف مشرف تھے جو سیکولر ذہن رکھتے تھے، اسی لیے جنرل زینی نے امریکی حکومت کو کہا تھا Mushraf is our last hope۔ اِس پس منظر میں ایک سازش کے تحت مشرف کو اقتدار پر قبضہ کرنے کی ترغیب دی گئی اور مشرف نے اصلاً ہوس اقتدار اور ظاہراً امریکہ کے بتائے ہوئے ملکی مفاد کے (باقی صفحہ 9 پر)

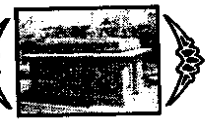

سید قاسم محمود

مسجد قرطبہ

(ہسپانیہ کی سرزمین بالخصوص قرطبہ میں لکھی گئی)

(پانچواں بند)

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش، اس کی شبوں کا گداز

اس کا مقامِ بلند، اس کا خیالِ عظیم
اس کا سرور اس کا شوق، اس کا نیاز اس کا ناز

ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کار کشا کارساز

خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی، اس کا دلِ بے نیاز

اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب، اس کی نگہ دل نواز

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز

نقطۂ پرکارِ حق، مردِ خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

عقل کی منزل ہے وہ، عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمی محفل ہے وہ

اس بند میں اقبال مردِ مومن کے اوصاف بیان کرتے ہیں۔ مسلمان جب عشقِ رسول ﷺ کی بدولت اپنے اندر شانِ فقر پیدا کر لیتا ہے تو اُس کی زندگی میں انقلابِ عظیم رونما ہو جاتا ہے۔ اقبال نے اِس بند میں اسی انقلاب کی تصویر کھینچی ہے۔

1۔ کہتے ہیں کہ اِس مسجد کو دیکھ کر مومن کی شان سمجھ میں آ سکتی ہے، اور اُس کے قلب کے سوز و گداز، اُس کی بلندیٔ خیال اور اُس کے جذبۂ عشق و مستی کا تصور ذہن میں قائم ہو سکتا ہے۔

2۔ تیری عظمت سے صاحبِ ایمان و یقین کے بلند مراتب کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور پتا چلتا ہے کہ اُن کے خیالات کتنے بلند تھے۔ مزید یہ کہ تیرے وجود سے اِس امر کا پتا بھی چلتا ہے کہ متعلقہ افراد میں ذوق و شوق کی پاکیزگی اور لطافت کا معیار کیا تھا، اور تیرے وسیع صحن میں سجدۂ نیاز کے متمنی بھی تھے اور اِس نیاز مندی میں نیاز کی شان بھی موجود تھی۔

3۔ اے مسجد قرطبہ! یہی وہ صاحبِ ایمان و یقین لوگ تھے جو رضائے الٰہی کے بغیر اپنی مرضی سے کوئی کام نہ کرتے تھے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس عمل کے عوض کہ اُن کی مرضی بھی رضائے الٰہی میں ڈھل جاتی ہے، اُن کا کوئی عمل ذاتی اغراض سے وابستہ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ خدائے عزوجل نے ان میں وہ صلاحیتیں پیدا کر دی ہیں جن کے سبب وہ اپنے حریفوں پر غالب آ جاتے ہیں۔ حاجت مندوں کی مشکلات کو رفع کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی حسنِ عمل کی راہ دکھاتے ہیں۔ بے شک ایسے ہی لوگ تھے جن کے ذہنوں میں تیری تعمیر کا جذبہ پیدا ہُوا اور انتہائی جدوجہد اور اپنی قوتِ عمل سے انہوں نے اس جذبے کو عملی جامہ پہنایا۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم نے اِس شعر کی شرح میں یوں لکھا ہے: ''جب مومن میں شانِ فقر پیدا ہو جاتی ہے تو اُس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہو جاتا، یعنی اُس میں صفاتِ ایزدی کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے، جس کی بدولت اُس کے اندر کارآفرینی، کارکشائی اور کارسازی کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔''

4۔ جن لوگوں میں صفاتِ ایزدی کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے، اُن کی تخلیق ہر چند کہ مٹی سے ہوئی ہے، لیکن اُن میں فرشتوں کے اوصاف در آئے ہیں اور اُن کے دل نورِ خدا سے تابندہ رہتے ہیں۔ جس کے سبب اُن کے دل دونوں جہانوں کی نعمتوں سے بے نیاز ہو جاتے ہیں، اور پھر وہ ذاتِ باری تعالیٰ کی رضا جوئی اور خوشنودی کے سوا اور کسی کے بارے میں نہیں سوچتے۔

5۔ ایسے صاحبِ ایمان لوگوں کے دلوں میں دنیاوی خواہشات کے لیے کم سے کم گنجائش ہوتی ہے، جبکہ اُن کے مقاصد بہت بلند ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ذات کی بجائے دوسروں کی بہتری کے لیے عملی اقدام کرتے ہیں۔ دوسروں کے ساتھ اُن کا رویّہ ہمیشہ انتہائی محبت والا اور نرم ہوتا ہے۔ بالکل اُسی طرح جیسے ہرن کی خوبصورت اور روایتی طور پر دلفریب آنکھوں میں ایک دل نواز چمک ہوتی ہے۔ اسی طرح اُن کی نگاہوں میں بھی یہی کیفیت محسوس کی جا سکتی ہے۔

6۔ مومن کی گفتگو میں نرمی اور محبت کا رنگ ہوتا ہے۔ جب وہ میدانِ جنگ میں جاتا ہے تو سراپا جدوجہد بن جاتا ہے، لیکن ان دونوں حالتوں میں، خواہ وہ مجلسِ احباب میں ہو، خواہ میدانِ جہاد میں، پاک طینت اور پاکباز ہوتا ہے۔

7۔ مومن اپنے یقین کی بدولت دنیا میں حق و صداقت کی تبلیغ کرتا ہے اور اُس کے یقین ہی کی بدولت دنیا میں حق کو ثبات حاصل ہوتا ہے، نیز اس دنیا میں صرف اُس کا یقین ایک ایسی شے ہے جسے حق کہہ سکتے ہیں۔ باقی یہ تمام دنیا بے حقیقت، عارضی اور فانی شے ہے۔

''وہم'' سے یہاں وہ شے مُراد ہے جس کی کوئی اصلیت نہ ہو۔

''طلسم'' وہ شے، جس کا ظاہر کچھ ہو، باطن کچھ ہو، یعنی دھوکا۔

''مجاز'' وہ شے جس کی کوئی حقیقت نہ ہو۔

وہم یقین کی ضد ہے۔ طلسم صداقت کی ضد ہے، اور مجاز حقیقت کی ضد ہے۔

8۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مومن میں عقل اور عشق دونوں صفات اپنی انتہائی ترقی یافتہ شکل میں جلوہ گر ہوتی ہیں، اور اِس دنیا کی ساری رونق اور شان و شوکت اُسی کے دم سے وابستہ ہے۔

آزادی کے ساٹھ سال:
ہم کہاں کھڑے ہیں؟ (2)

مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں امیر تنظیم اسلامی محترم حافظ عاکف سعید صاحب کے 24 اگست 2007ء کے خطبۂ جمعہ کی تلخیص

گزشتہ خطاب جمعہ میں یوم آزادی کے حوالے سے ہم نے اپنا جائزہ لینے کی کوشش کی تھی کہ 14 اگست 1947ء کو ہمیں آزادی کی جو عظیم نعمت حاصل ہوئی تھی، ان ساٹھ سالوں میں ہم کہاں کھڑے ہیں! خود احتسابی زندہ قوموں کا شعار ہوتا ہے۔ سنجیدہ اور باوقار اقوام یوم آزادی کو ہلہ گلہ، بے فکری اور بچگانہ انداز میں ہلڑبازی میں گزار کر خوش نہیں ہوتیں بلکہ وہ ایسے موقع پر یہ جائزہ لیتی ہیں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں اور اپنی منزل کی طرف ہم نے کیا پیش قدمی کی ہے؟ اس حوالے سے پاکستان کا معاملہ تو خاص طور پر زیادہ اہم ہے کیونکہ یہ ایک نظریہ کی بنیاد پر آج سے ساٹھ سال قبل دنیا کے نقشے پر ظاہر ہوا تھا۔ چنانچہ اس پہلو سے دیکھنے کی زیادہ ضرورت ہے کہ جس نظریہ کی خاطر ہم نے پاکستان بنایا اس میں کیا پیش رفت ہوئی! آیا یہاں اس نظریئے کو استحکام ملا یا اس کی جڑیں کھودی گئیں؟

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی نظریاتی ریاست ہو، اس کی اصل بقاء اور استحکام کا دارومدار اس کے نظریئے کے استحکام پر ہے، اس لئے کہ وہ اس کی بنیاد ہے۔ اگر وہ بنیاد کھوکھلی ہونی شروع ہو جائے اور کچھ نادان لوگ اپنے ہی ملک کی نظریاتی بنیادوں پر تیشے چلانے لگ جائیں تو پورا ملک عدم استحکام کا شکار ہو جائے گا۔ ایک حدیث میں نہی عن المنکر کے حوالے سے ایک بڑی خوبصورت تمثیل ہے کہ ایک بحری جہاز میں کچھ لوگ سوار ہیں۔ کچھ نچلے حصے میں ہیں، کچھ اوپر عرشہ پر ہیں۔ نیچے والوں کو پانی لینے کے لیے اوپر آنا پڑتا ہے جس سے انہیں بھی تکلیف ہوتی ہے اور اوپر والے بھی تنگ ہوتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں اگر نیچے والے جہاز کے پیندے میں سوراخ کر کے وہاں سے پانی حاصل کرنا چاہیں گے تو کیا ہوگا؟ وہ جہاز ڈوبے گا، اور جب ڈوبے گا تو صرف نیچے والے نہیں ڈوبیں گے بلکہ سب افراد ڈوبیں گے۔ لہٰذا سوچنا چاہیے کہ کہیں ہم نادانوں کی طرح اپنے اس نظریئے پر جو ہمارے ملک کی بنیاد اور اساس ہے، تیشہ تو نہیں چلا رہے! پھر یہ کہ ہر نظریاتی ملک کا ایک ہدف اور نصب العین ہوتا ہے۔ اس ہدف کے حوالے سے کیا ہم نے آگے کوئی قدم بڑھایا ہے یا ہمارا سفر پیچھے کی طرف ہے؟ یہ جائزہ لینا ضروری ہے۔

علامہ اقبال نے یہ بات کہی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنا جائزہ لینا چاہتا ہے تو سب سے پہلے وہ یہ غور کرے کہ میں اللہ کی نگاہ میں کس جگہ پر ہوں! پھر وہ دیکھے کہ دوسرے لوگ مجھے کس نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنے باطن میں جھانکے کہ میں خود اپنے اعتبار سے کہاں کھڑا ہوں! خود احتسابی کے یہ تین درجے ہیں۔ آزادی یقیناً اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اگر یہ نعمت ہمیں دی ہے تو پھر اللہ کا ایک ضابطہ بھی ہے۔ سورۂ یونس کی آیت 14 کے مطابق کسی قوم کو زمین پر غلبہ و اقتدار عطا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ یہ دیکھتا ہے کہ وہ لوگ کیسے عمل کرتے ہیں! چنانچہ ان ساٹھ سالوں میں ہم نے کیا کیا، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی دیکھ رہا ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اگر اللہ نے ہم پر احسان کیا، ایک بڑی نعمت عطا کی تو اس کی ہم سے کیا توقعات ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ خود ہی بتا سکتے ہیں، میں اور آپ اس کا تعین نہیں کر سکتے۔ سورۃ الانفال کی آیت 26 میں اگرچہ مہاجرین مکہ سے خطاب ہے لیکن یہ آیت برصغیر کے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی پر بھی پوری طرح صادق آتی ہے۔ اس آیت کے آخری حصے میں اللہ کی اس توقع کا ذکر ہے جو اس کو ہم سے تھی، یعنی ''تاکہ تم اس کا شکر بجالاؤ''۔

اللہ کا شکر کیا ہے؟ امام راغب اصفہانیؒ نے شکر کے تین درجے معین کیے ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ دل میں احساس ہو کہ اللہ نے ہم پر کتنا بڑا فضل فرمایا ہے۔ یہ احساس بھی اب ہمارے اندر نہیں۔ پھر زبان سے اقرار کہ اللہ نے واقعی بہت بڑا احسان کیا۔ اب ہماری زبانوں سے یہ بھی ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ہمیں مسلم لیگ کی تحریک سے آزادی ملی تھی لیکن اس کے لیے اسباب یقیناً اللہ تعالیٰ نے بنائے۔ قائداعظم کی شخصیت بھی اللہ کی ایک عطا تھی۔ انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کا مقدمہ اس خوبصورتی سے لڑا کہ انگریز اور ہندو دونوں کو شکست دے دی۔ وہ شخص انگریزوں اور ہندوؤں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا تھا۔ اس میں فہم و فراست، دیانت اور قابلیت تھی۔ وہ اصولوں کا پکا تھا۔ اس نے اپنے کردار کا لوہا منوایا۔ یہ سب کچھ بھی اللہ کی طرف سے ہم پر خصوصی کرم تھا۔ بہرکیف اللہ کے فضل و کرم کو بھول کر صرف اسباب ہی کا ذکر کرتے رہنا اب ہماری عادت ہو گئی ہے۔ اس کے بعد شکر بالجوارح کا درجہ آتا ہے کہ اپنے عمل سے شکر ادا کرنا، مجسم سراپا سپاس بن جانا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس رب نے اتنے احسانات کیے اس کا ہر حکم سر آنکھوں پر رکھا جائے، اس کی بندگی پہلے سے زیادہ جوش و جذبہ کے ساتھ کی جائے اور اُس کے عائد کردہ دینی فرائض کو پہلے سے زیادہ ہمت کے ساتھ انجام دیا جائے۔ تحریک آزادی کے دوران ہم نے وعدہ کیا تھا کہ نئی مملکت کو ہم پوری دنیا کے لیے ایک روشنی کا مینار بنا دیں گے، ایک مثالی اسلامی فلاحی ریاست قائم کریں گے لہٰذا شکر کا تقاضا تھا کہ اللہ سے کیے ہوئے اس وعدے کو پورا کیا جاتا، پوری قوم اس فکر کے اندر مبتلا ہوتی، اس کے تقاضوں کو پورا کیا جاتا..... لیکن پاکستان بنتے ہی سب وعدے بھلا دیئے گئے! قرآن مجید میں ایک عام غافل انسان کی نفسیات کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ کوئی مشکل وقت پڑنے پر وہ بڑی لمبی لمبی دعائیں کرتا ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ مشکل وقت گزار دیتا ہے تو وہ اللہ کے ساتھ کیے گئے وعدوں اور قول و قرار کو ایسے فراموش کر دیتا ہے جیسے اُس نے کبھی دعا کی ہی نہیں تھی۔ کسی کام کے لیے اللہ کو پکارا ہی نہیں تھا! سورۂ یونس کی آیت 12 میں فرمایا گیا:

﴿ وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ﴾

''اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو لیٹا اور بیٹھا اور

کھڑا (ہر حال میں) ہمیں پکارتا ہے۔ پھر جب ہم اس تکلیف کو اس سے دُور کر دیتے ہیں تو (بے لحاظ ہو جاتا اور) اس طرح گزر جاتا ہے گویا کسی تکلیف پہنچنے پر ہمیں کبھی پکارا ہی نہ تھا۔''

چنانچہ ہم نے بحیثیت قوم یہ روش اختیار کی! شکر کے حوالے سے اللہ نے ایک اور قاعدہ بھی بیان فرمایا ہے کہ:

﴿ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝ ﴾ (سورہ ابراہیم:7)

''اور جب تمہارے پروردگار نے (تم کو) آگاہ کیا کہ اگر شکر کرو گے تو میں تمہیں زیادہ دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو (یاد رکھو کہ) میرا عذاب (بھی) سخت ہے۔''

آج ساٹھ سال گزرنے کے بعد ہم نے پایا کیا ہے اور گنوایا کیا ہے، جائزہ لے لیجیے! آدھا پاکستان تو چوبیسویں سال ہی ہم نے گنوا دیا تھا۔ ہم پر اللہ کے عذاب کا کوڑا برسا، اس لیے کہ شکر نہیں کیا۔ پھر یہ کہ کشمیر جسے ہم اپنی شہ رگ کہتے ہیں، اس کا ایک انچ بھی ہم مزید نہیں لے سکے، بلکہ ساٹھ سالوں میں اپنے اصولی موقف سے پیچھے ہٹتے ہٹتے بھارت کے سامنے بالکل سربسجود ہیں۔ سب سے بڑی کامیابی یہ سمجھی جا رہی ہے کہ بھارت نے اسے ایک متنازعہ مسئلہ تسلیم کر لیا ہے۔ گویا بہت بڑا تیر مار لیا گیا! چاہے اس کے لیے اس کی کتنی ہی شرائط ماننی پڑی ہیں۔ امریکہ کی طرف سے کیا کیا دباؤ ہے جس کو قبول کر کے صرف اتنی بات آپ اس سے منوا سکے ہیں کہ ہاں یہ ایک متنازعہ معاملہ ہے..... لیکن اس کے بعد بھی عملاً کیا ہو رہا ہے! سرکاری نقشوں سے بھی کشمیر غائب ہے۔ ایک زمانے میں کم سے کم اوپر چھتری سی تو بنی ہوتی تھی۔ انٹرنیشنل نقشوں میں تو وہ کبھی بھی پاکستان کا حصہ نہیں دکھایا گیا، اب ہماری اپنی نصابی کتابوں میں سے بھی نکل رہا ہے۔ یہ درحقیقت وہی ناشکری اور ناقدری ہے جس کی سزا مل رہی ہے۔ اللہ کی نگاہ میں ہم شکر گزار قوم نہیں ہیں، ناشکرے اور ناقدرے ہیں!

ہم نے وعدہ کیا تھا: ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ''۔ قائداعظم سے جب بھی پوچھا جاتا کہ آپ جو ملک بنانے چلے ہیں اس کا دستور کیا ہوگا، تو وہ مومنانہ جواب دیتے کہ ''ہمارا دستور چودہ سو سال پہلے معین ہو چکا۔ قرآن ہمارا دستور ہے۔'' آج ساٹھ سال کے بعد وہ وعدہ کہاں ہے؟ قرآن تو کہتا ہے کہ اگر سود کو نہیں چھوڑتے تو اللہ اور رسول ﷺ کی طرف سے اعلان جنگ ہے۔ وفاقی شرعی عدالت نے ایک لمبی کارروائی کے بعد بینک انٹرسٹ کو ربا قرار دیا اور حکومت سے کہا کہ اس کو درجہ بدرجہ اسلامائز کرے۔ لیکن ہر حکومت نے اس کے خلاف عمل کیا۔ سب سے پہلے نواز شریف حکومت نے اس فیصلے کے خلاف حکم امتناعی حاصل کیا۔ اس کے بعد جو کام ہوا، جو پیش رفت ہوئی اس سب کو مشرف صاحب نے کالعدم اور غیر مؤثر کر دیا۔ ہم قرآن کو ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔ حکومتیں کیا، عوام بھی ماننے کے لیے تیار نہیں۔ ہم تو سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ کاروبار تب کریں جب ہمیں یقین ہو جائے کہ بینک کی شرح سود سے زیادہ ہمیں اس کے اندر فائدہ ہو گا۔ کون نقصان کا خطرہ اٹھانے کو تیار ہے! سیونگ اکاؤنٹ میں پیسے رکھواؤ اور سود کھاؤ۔ یہ عوام کا حال ہے، الا ماشاء اللہ۔ چنانچہ وہ وعدہ ہم نے بھلا دیا!

جب وعدہ بھول گئے اور اللہ تعالیٰ سے وعدہ خلافی کی تو اللہ تعالیٰ کی ایک اور سنت ہے جو سورۂ توبہ کی آیات 75، 76، 77 میں بیان ہوئی۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر کچھ لوگ یا کوئی قوم اللہ سے یہ وعدہ کرے کہ پروردگار، تو ہمیں فلاں شے عطا کر دے تو ہم خوب صدقہ و خیرات کریں گے اور نیک بن جائیں گے، اس کے بعد جب اللہ وعدہ پورا کر دے اور وہ اس وعدے سے منحرف ہو جائیں تو ایسے لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نفاق کو جاگزیں فرما دیتا ہے۔ یہ نفاق دراصل نفاق عملی ہوتا ہے، جو بطور عقوبت اور سزا ان کے دلوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اس نفاق عملی کے چار مظاہر یا علامات ہیں، جن سے آپ پہچان سکتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے ہمارے لیے رہنمائی فرما دی کہ یہ پہچانا ہو کہ کس کے دل میں نفاق ہے تو یہ چار اوصاف دیکھ لو۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ جس میں یہ چاروں اوصاف ہوں وہ تو خالص، پکا، کٹر منافق ہے۔ اور جس میں ایک یا دو یا تین اوصاف ہیں وہ اسی درجے کا منافق ہے چاہے وہ نماز پڑھتا ہو، روزہ رکھتا ہو اور اپنے آپ کو بڑا مومن سمجھتا ہو!

i) جھوٹ بولنا: میں بڑے دکھ کے ساتھ عرض کر رہا ہوں کہ جھوٹ بولنے کو ہم اب کوئی برائی سمجھتے ہی نہیں۔ عام مسلمانوں ہی کا نہیں، دیندار طبقے کا بھی آج یہی حال ہے۔ وعدے سے پھر جانا، غلط بیانی کر دینا کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا ہے۔ جب ہم اپنے کسی مفاد پر زد پڑتا دیکھیں تو جھوٹ بولنے کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ آپ جائزہ لے کر دیکھ لیجیے، معاشرے میں اسے برائی کے طور پر لیا ہی نہیں جاتا۔

ii) وعدہ خلافی: یہ بھی ہمارا ایک ایسا شعار بن گیا ہے کہ اگر کوئی وعدہ پورا کرے تو اس پر حیرت ہوتی ہے، تعجب ہوتا ہے کہ کوئی وعدہ پورا کرنے والا بھی اس ملک میں ہے!

iii) خیانت: اس کا بڑا وسیع مفہوم ہے۔ اپنی حیثیت اور اپنے سرکاری منصب کا ناجائز استعمال بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔ کیا ہم نے اسے اپنا حق نہیں سمجھ رکھا؟ یہ اقربا پروری اور سفارش کا کلچر کیا ہے؟ یہ بھی بددیانتی اور خیانت ہے۔ تصورات مسخ ہو چکے ہیں۔ اصول پرستی غائب ہے۔ آپ کسی محکمے میں ہوں اور اصولوں پر قائم ہو جائیں، دوستوں اور عزیزوں کی سفارش نہ مانیں تو وہ کہیں گے پاگل اور احمق ہے۔ جانے کس زمانے میں بستا ہے! یہ ہمارا ایک قومی مزاج بن گیا ہے، حالانکہ یہ بہت بڑی خیانت ہے۔ سفارش کا کوئی مطلب نہیں ہے، میرٹ پر بات ہونی چاہیے، اصول اور دیانت کا تقاضا تو یہی ہے۔ اسی طرح رشوت تو اس سے بھی آگے کی شے ہے، وہ تو ہے ہی حرام مطلق! لیکن آج ہر مسئلے کی کلید رشوت ہے۔ اسے بھی ہم نے ایک norm کی حیثیت سے تسلیم کر لیا ہے کہ پاکستان میں کوئی کام رشوت کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ہیں وہ مظاہر جو اس قوم کے اندر پیدا ہو چکے ہیں۔

iv) بدزبانی: ذرا جھگڑا ہو تو گالم گلوچ پر اُتر آنا، آپے سے باہر ہو جانا۔ تحمل، بردباری، ٹھنڈا مزاج، ردعمل فوراً ظاہر نہ کرنا، معاملے کو منفی انداز میں نہ لینا بلکہ اس پر غور و فکر کرنے کے بعد کوئی رائے قائم کرنا..... یہ خصوصیات تو آج ہم میں ہیں ہی نہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر پستول نکل آتے ہیں، چھری نکل آتی ہے، اینٹیں اٹھالی جاتی ہیں۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا:

﴿ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾ (آل عمران:139)

''(اے اہل ایمان!) اگر تم مومن (صادق) ہو تو تم ہی غالب (اور سربلند) رہو گے''

نبی اکرم ﷺ نے اسی بات کو یوں واضح فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهٖ آخَرِيْنَ)) (رواہ مسلم)

''اللہ تعالیٰ اس کتاب پاک (قرآن مجید) کی وجہ سے بہت سوں کو اونچا کرے گا اور بہت سوں کو نیچے گرائے گا۔''

یعنی اللہ تعالیٰ اس قرآن کی بدولت لوگوں کو، قوموں کو ترقی اور عروج عطا فرمائے گا اور اس قرآن کو چھوڑ دینے کی پاداش میں، اس دین سے بے وفائی کی سزا کے طور پر قوموں کو ذلت و زوال سے دوچار کرے گا۔ اس اعتبار سے اپنا جائزہ لے لیجیے کہ آج ہم کہاں ہیں! کیا ہم دنیا میں ایک برتر، غالب اور سربلند قوم ہیں؟ کیا ہم بام عروج پر ہیں؟ .....نہیں! وہ آزادی جو ہمیں ساٹھ سال پہلے ملی تھی، اس کا بھی بیشتر حصہ ہمارے ہاتھ سے نکل چکا۔ اب تو ہم خود فریبی کا شکار ہیں کہ ہم آزاد ہیں۔ امریکہ تو اب ہمارے معاملات میں کھلم کھلا دخل اندازی کر رہا ہے۔ وہاں سے صاف صاف کہا جا رہا ہے کہ امریکہ کی پلانگ مشرف کو صدر اور بینظیر کو وزیراعظم بنانے کی ہے۔ اب انہیں یہ باتیں خفیہ رکھنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ پاکستانی قوم اپنے آپ کو ہماری محکوم اور غلام سمجھتی ہے۔ اس سے پہلے ہمارے قومی معاملات اور ملکی سیاست کے اندر یہ مداخلت پس پردہ ہوتی تھی، اب وہ کھل کر سامنے

آتے ہیں کہ تمہارے معاملات ہمارے اختیار میں ہیں۔ لہٰذا ان آیات واحادیث کی روشنی میں اپنا جائزہ لے لیجیے کہ ہم اللہ اور رسول ﷺ کی نگاہ میں کہاں کھڑے ہیں!

دوسروں کی نگاہ میں ہمارا کیا مقام ہے، اس کو بھی زیادہ تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے، یہ بہت واضح ہے۔ اسی چودہ اگست کے موقع پر بی بی سی کا تبصرہ بہت اہم اور بڑا معنی خیز تھا کہ ساٹھ سال میں اسلامی جمہوریہ پاکستان میں نہ اسلام آیا نہ جمہوریت آئی۔ انہیں بھی معلوم ہے کہ یہ ملک اسلام کے نام پر لیا گیا تھا۔ آج ہمارے دانشور اس کوشش میں ہیں کہ اسلام کے ساتھ اس ملک کا نظریاتی رشتہ کاٹ دیا جائے۔ کہا جارہا ہے کہ محض معاشی تنگ دستی کی وجہ سے ایک قوم نے الگ خطہ زمین لیا، اس میں مذہب کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ یہ حقائق کو مسخ کرنے اور انہیں ڈھٹائی کے ساتھ جھٹلانے کے مترادف ہے۔ قائداعظم نے متعدد مواقع پر کہا تھا کہ ہم ہندو سے ہر اعتبار سے الگ قوم ہیں۔ ہمارا دین الگ ہے، ہماری مذہبی رسومات الگ ہیں، ہماری سماجی اور سیاسی اقدار الگ ہیں۔ اس نظریاتی بنیاد کو ہم نے مضبوط نہیں کیا، چنانچہ دنیا آج ہمیں ایک ناکام ریاست (Failed Nation) کہہ رہی ہے۔ وقفے وقفے سے اس قسم کے شوشے چھوڑے جاتے ہیں کہ فلاں سن کے بعد پاکستان کا وجود نہیں رہے گا۔ خائم بدہن! اگر چہ ہوگا وہی جو اللہ کو منظور ہوگا لیکن بتانا یہ مقصود ہے کہ دنیا ہمیں اس نگاہ سے دیکھ رہی ہے۔ دوسروں کی نظر سے، دوسروں کی عینک سے آپ اپنے آپ کو دیکھیں۔ یہ خود احتسابی کا دوسرا درجہ ہے کہ ع کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا! پچھلے دنوں اخبارات میں ایک rating آئی تھی کہ وہ ممالک جہاں سب سے زیادہ امن وامان اور قانون کی عملداری ہے، جہاں کا ماحول انسانی حقوق کے اعتبار سے سب سے بہتر ہے، اس میں پاکستان آخری دس ممالک میں تھا۔ اندازہ کر لیجیے کہ اسلام کے نام پر بننے والا ملک اس اعتبار سے پستی کی انتہاؤں میں ہے۔ اسی کا ایک مظہر یہ ہے کہ آج دنیا میں پاکستان کا گرین پاسپورٹ ہرگز عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ جو لوگ بیرون ملک سفر کرتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ اس گرین پاسپورٹ کی وجہ سے کیسی ذلت ورسوائی ہوتی ہے۔ یہ ہے آج دنیا کی نگاہ میں ہمارا مقام!

ہمیں یہ جائزہ بھی لینا ہے کہ پچھلے سال کے مقابلے میں آج ہم خود اپنی نگاہ میں کہاں کھڑے ہیں! ہمارے مختلف اداروں کا کیا حال ہے؟ ہماری سیاست میں بہتری ہوئی ہے یا تنزلی؟ ہماری آزادی وخودمختاری پہلے کے مقابلے میں کس مقام پر ہے؟ اس حوالے سے گفتگو ان شاء اللہ آئندہ جمعہ کو ہوگی!

اللہ تعالیٰ ہمیں سوچ اور عمل دونوں کی صحت اور سلامتی سے نوازے۔ آمین! (مرتب: محمد خلیق)

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام قرآن اکیڈمی کے

رجوع الی القرآن کورس

میں داخلے کے لیے طالبانِ قرآن سے درخواستیں مطلوب ہیں!

تعلیم یافتہ حضرات کے لیے قرآن حکیم کو سمجھنے اور فہم دین کے حصول کا سنہری موقع

یہ کورس بنیادی طور پر گریجوایٹس اور پوسٹ گریجوایٹس کے لیے ترتیب دیا گیا ہے تاکہ وہ حضرات جو کم از کم گریجوایشن کی سطح تک اپنی دنیاوی تعلیم مکمل کر چکے ہوں اور اب بنیادی دینی تعلیم بالخصوص عربی زبان سیکھ کر فہم قرآن کے حصول کے خواہش مند ہوں، انہیں اس کورس کے ذریعے ایک ٹھوس بنیاد فراہم کر دی جائے تاہم بعض استثنائی صورتوں میں ایف اے کی بنیاد پر بھی اس کورس میں داخلہ لیا جا سکتا ہے۔

نصاب

1) عربی صرف ونحو
2) ترجمہ قرآن (تقریباً پانچ پارے)
3) آیاتِ قرآنی کی صرفی ونحوی تحلیل (تقریباً دو پارے)
4) قرآن حکیم کی فکری وعملی راہ نمائی (منتخب دروسِ قرآن)
5) تجوید وحفظ
6) مطالعۂ حدیث
7) اصطلاحاتِ حدیث
8) اضافی محاضرات

کورس کا آغاز ان شاء اللہ 10 ستمبر سے ہوگا اور کورس کا دورانیہ نو (9) ماہ ہوگا۔

کورس کا تفصیلی پراسپکٹس

جس میں داخلے سے متعلق ضروری معلومات کے علاوہ کورس میں شامل مضامین کی تفصیل، طریق تدریس اور نظام الاوقات کی وضاحت بھی شامل ہے، درج ذیل پتے سے حاصل کریں:

ناظم شعبۂ تدریس، قرآن اکیڈمی

36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور (فون: 3-5869501)

email : irts@tanzeem.org

حماس پر پابندی اور ہماری دینی سیاسی جماعتیں

ڈاکٹر اسرار احمد

راقم الحروف نے ایک مرتبہ امریکی جریدے News Week میں ارضِ فلسطین کے بارے میں ایک بہت عمدہ جملہ پڑھا تھا کہ: "Too Small a geography but too big a history" یعنی ارض فلسطین جغرافیے کے اعتبار سے بہت چھوٹا خطہ ہے مگر تاریخی اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ارض فلسطین کی تاریخ 5 ہزار سال سے زائد ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس خطے کی تاریخ کا آغاز انبیاء کرام علیہم السلام کے سلسلہ سے ہوتا ہے۔ قبلہ اوّل بھی یہیں ہے۔ تاریخی اہمیت کی حامل یہ سرزمین ایک عرصہ سے عالم کفر کی گھناؤنی سازشوں کا مرکز بنی ہوئی ہے اور موجودہ سازشوں میں فلسطینی صدر محمود عباس ''ترک ناداں'' بنتے ہوئے امت کی ''قباچاک'' کرنے کے درپے ہے۔ بدقسمتی کی بات ہے کہ امت مسلمہ پر ایک عذاب امریکہ اور اس کے حواریوں کے صلیبی لاؤلشکر کی صورت میں آیا ہوا ہے تو دوسری جانب اس سے بھی بڑا عذاب امریکہ نواز مسلمان حکمرانوں کا وجود ہے جن کی حیثیت کٹھ پتلیوں سے زیادہ نہیں ہے۔ ان کی ڈوریں کہیں اور سے ہلتی ہیں اور یہ حکمران اپنے آقا اور فرعون وقت جارج ڈبلیو بش کی خوشنودی کے لیے ہر حد کو عبور کرنے کے لیے ہر لمحے بے تاب نظر آتے ہیں۔ گویا ان کی کیفیت اس شعر کی غماز ہے کہ ؎

میرا یہ حال بوٹ کی ٹو چاٹتا ہوں میں
ان کا یہ حکم دیکھ میرے فرش پر نہ رینگ

حماس فلسطینی مسلمانوں کی حقیقی اور واقعی ترجمان جماعت ہے اور اس جماعت کی ایک خاصیت یہ ہے کہ اس نے فلسطین کے قلب میں واقع امریکہ کی لے پالک اور ناجائز ریاست اسرائیل کے ناپاک وجود کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ حماس ایک عرصہ تک مسلح جدوجہد کے ذریعے کامیابی حاصل کرنے میں مشغول رہی ہے مگر اُس نے اپنی ترکی کی رفاہ پارٹی کے مانند اور پوری دنیا میں مسلمہ سماجی خدمات کی بنیاد پر فلسطین میں ہونے والے انتخابات میں حصہ لیا اور شاندار کامیابی حاصل کی۔ یاسر عرفات کے جانشین محمود عباس کی جماعت ''الفتح'' حماس کی شاندار کامیابی کو برداشت نہ کرسکی۔ حالانکہ حماس نے انتخابی کامیابی کے بعد مسلح سرگرمیوں کو ترک کر دیا تھا اور معروف معنوں میں حقیقی جمہوری پارٹی بن گئی تھی۔ مگر اس سب کے باوجود امریکہ اور اسرائیل کو حماس کی بے مثال کامیابی ایک آنکھ نہ بھائی اور روزِ اول سے دونوں طاقتیں حماس کو کمزور کرنے کے لیے سازشوں میں مصروف ہوگئیں حالانکہ فلسطینی انتخابات کو غیر ملکی اور غیر جانبدار مبصرین نے منصفانہ اور آزادانہ قرار دیا تھا۔ اِن مبصرین میں سابق امریکی صدر جمی کارٹر بھی شامل تھے۔

اسی اثناء میں ''الفتح'' کے کارکنوں نے ملک میں فسادات کا آغاز کر دیا۔ ان فسادات کے نتیجے میں کئی فلسطینی مسلمان موت کی وادی میں اتر گئے۔ ان عالمی استعماری قوتوں نے حماس کو ناکام بنانے کے لیے اُن کی امداد بند کر دی۔ اب ملازین کی تنخواہیں ادا کرنے کے لیے بھی حماس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ اس صورتِ حال میں ایران نے کچھ مالی امداد کی تو وزیراعظم اسماعیل ہانیہ کو فلسطینی حدود میں داخل ہونے سے روک دیا گیا۔ فلسطینی حالات میں بہتری کے لیے کچھ عرصہ قبل سعودی فرمانروا شاہ عبداللہ نے بھی کردار ادا کیا اور صدر محمود عباس، وزیراعظم اسماعیل ہانیہ اور حماس کے سربراہ خالد مشعل کو مکہ مکرمہ بلا کر مفاہمت بھی کرائی، مگر نتیجہ وہی ''ڈھاک کے تین پات'' مذکورہ بالا صورتِ حال میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ امریکہ جو جمہوریت کا چیمپئن ہونے کا دعویدار ہے اور جس کے مبصرین بھی فلسطینی انتخابات میں حماس کی کامیابی کو منصفانہ اور آزادانہ قرار دے چکے ہیں اس سب کے باوجود اس نے فلسطین کی منتخب حکومت اور جماعت کو سیاسی عمل سے آمرانہ انداز میں نکال کر دم لیا، مگر پوری دنیا میں امریکہ کے اس منافقانہ انداز پر کسی نے طعن و تشنیع نہیں کی۔ حماس کا صرف یہ قصور تھا کہ وہ اسرائیل کے ناجائز وجود کی انکاری تھی اور اس کی قیادت الفتح کے مقابلے میں فلسطین کے لیے زیادہ مخلص انداز میں کام کر رہی تھی۔

عوامی حکومت کا قتل پہلی مرتبہ فلسطین میں نہیں ہوا۔ اس سے قبل ترکی میں دینی جماعت کی حکومت کو گرانے کے لیے سازشوں کا بازار گرم کیا گیا اور اس کی حکومت کو چلتا کیا گیا۔ صومالیہ اور سوڈان کی عوامی حکومتوں کے خاتمے کے لیے میزائلوں اور بموں کا بے دریغ استعمال کیا گیا۔ الجزائر میں منتخب عوامی جماعت کا راستہ روکنے کے لیے قومی فوج عالمی استعماری قوتوں کی آلۂ کار بن گئی اور حکومت تک پہنچنے کے تمام راستے مسدود کر دیئے۔ اس کے علاوہ اور کئی ایسی مثالیں موجود ہیں جن کے پیچھے عالم کفر کے امام امریکہ کا دوغلا کردار نظر آتا ہے۔ یہ صورتِ حال ہماری دینی سیاسی جماعتوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ ہماری دینی جماعتیں 60 سال سے اقتدار کے حصول کے کھیل میں شریک ہیں مگر نتیجہ بے سود۔ اگر انہیں چند جزوی کامیابیاں حاصل بھی ہوئیں تو اس کا فائدہ سیکولر حکمرانوں نے حاصل کیا۔ موجودہ دور میں جو کامیابی ایم ایم اے کو حاصل ہوئی ہے اس کی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔ امید کی جارہی تھی کہ دینی جماعتوں کا یہ اتحاد اسمبلی میں پریشر گروپ کا کام کرے گا۔ مگر پانچ سالہ دور میں کسی بھی موقع پر ایم ایم اے نے اسمبلی میں پریشر گروپ ہونے کا تاثر نہیں دیا۔ الٹا سترھویں ترمیم کی حمایت کر کے مشرف کے تمام غیر جمہوری اور غیر آئینی اقدامات کو تحفظ دینے کا ''گناہ عظیم'' کیا۔ قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف کا عہدہ ایم ایم اے کے پاس ہے مگر اسی اسمبلی میں تحفظ حقوق نسواں بل کے نام پر ایک غیر اسلامی بل پاس کیا گیا۔ اس موقع پر ایم ایم اے کی قیادت نے اسمبلی سے مستعفی ہونے کی دھمکی دے کر دینی حمیت کا اظہار اور عوامی جذبات کی ترجمانی کی مگر بعد میں ''سجدہ سہو'' کر کے عوام کے جذبات کو دھچکا پہنچایا۔ اسی اتحاد کی موجودگی میں وفاقی دارالحکومت اسلام آباد میں ''اپریشن سائلنس'' کے ذریعے شریعت کی بالادستی کی آواز بلند کرنے والوں کو خاموش کر دیا گیا۔ ایم ایم اے کا موقف تھا کہ لال مسجد انتظامیہ کا موقف صد فیصد درست تھا مگر طریق کار غلط تھا۔ صد فی صد صحیح موقف والوں کے اس طرح ماورائے عدالت اور بہیمانہ قتل عام پر معمولی ردِعمل کا اظہار بہت افسوس ناک ہے۔ شمالی علاقہ جات میں انسانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا جارہا ہے۔ مگر اسمبلی اور سینٹ میں ایم ایم اے کی زوردار آواز حکومت کو اُس کے ارادوں سے باز رکھنے کے لیے بلند نہیں ہوئی۔

دینی جماعتوں کی آنکھیں کھول دینے کے لیے تو مشرف بے نظیر ملاقات بھی کافی ہے۔ وہ صدر جو بے نظیر کو سیکورٹی رسک قرار دیتا تھا، خفیہ طریقے سے ابوظہبی گیا اور خفیہ ملاقات کر کے آیا۔ پہلے ملاقات کو چھپانے کے کئی جتن کیے گئے اور کئی مواقع پر دونوں جانب سے انکار بھی ہوا مگر بعد ازاں اقرار بھی کر لیا گیا۔ اس ملاقات کے مقاصد کیا

ہیں؟ سیدھی سی بات ہے کہ مستقبل میں امریکی ایجنڈے کو کامیابی سے ہمکنار کرانے کے لیے مشرف اور بے نظیر بھٹو اہل امیدوار ہیں اور دونوں اس عزم کا کئی بار اظہار کر چکے ہیں کہ بنیاد پرست (دینی قوتوں) عناصر کو کچلنے کے لیے ہم ہر حد پر جانے کے لیے تیار ہیں۔ اس صورتِ حال میں انتخابی کھیل میں شریک ہو کر خاطر خواہ کامیابی کا حصول دینی جماعتوں کی خام خیالی ہے۔ لہٰذا کامیابی کی واحد راہ ''پرامن، منظم عوامی تحریک'' ہے۔ اس صورت میں کامیابی حاصل کرنے والی تحریکوں کا راستہ روکنا امریکہ اور اس کے مسلمان حکمران ایجنٹوں کے لیے ممکن نہیں ہوگا۔

دینی قیادت سے دین کا طالب علم ہونے کی حیثیت سے گزارش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ موجودہ دور ''عالمی تہذیبی تصادم'' (Clash of civilization) اور آخری صلیبی جنگ (The last crusade) کا ہے اور دونوں اصطلاحیں کسی دینی مذہبی مدرسے کسی مسجد کے خطیب یا مسلمان دینی رہنما کی وضع کردہ نہیں ہیں۔ پہلی اصطلاح کا خالق امریکہ کا مشہور مفکر ہنٹنگٹن ہے، جس نے اپنے مقالے میں تہذیبی تصادم کی نشاندہی کی اور اس میں مدمقابل اسلامی تہذیب کو قرار دیا۔ صلیبی جنگ کی اصطلاح بھی امریکی صدر بش نے افغانستان پر حملے کے وقت استعمال کی تھی اور آخری صلیبی جنگ کا سب سے بڑا خواہاں عیسائیوں کا عظیم تر فرقہ یعنی رومن کیتھولک ہے، جس کے آنجہانی سربراہ پوپ نے اتحاد یورپ کی شکل میں دراصل ''مقدس رومی سلطنت'' (Holy Roman Empire) کی تجدید کا ڈول ڈالا تھا اور جس کے حالیہ پوپ نے اسی ملک فرانس میں مسلمانوں اور نبی اکرم صلی اللہ وسلم کے خلاف زہر اگلا ہے، جہاں ایک ہزار سال قبل پوپ اربن ثانی نے صلیبی جنگ کے آغاز کے لیے عیسائیوں کو انتہائی جذباتی انداز میں ابھارا تھا..... دوسری جانب عیسائیوں کا دوسرا فرقہ Baptists ہے جو کہ پروٹسٹنٹ عیسائی ہیں اور ان میں اخص الخواص ''Evangelists'' ہیں جو صیہونی ریاست کے مذہبی یہودیوں سے بڑھ کر حامی اور مددگار ہیں اور جارج ڈبلیو بش اسی فرقے کا پیروکار ہے۔ لہٰذا اس صورتِ حال میں عالمی تہذیبی جنگ اور صلیبی جنگ سے انکار حقیقت کو دیکھ کر آنکھیں موندنے کے مترادف ہیں۔ اس دجالی دور میں تمام بھسائل کا حل، ''علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!'' کے مصداق ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ قوم کو پورے دین پر عامل ہونے کی دعوت پیش کرتے ہوئے ایسے افراد کو مجتمع کیا جائے جو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں دین پر عمل کرنے کا عزم مصمم کر چکے ہوں اور اطاعت امیر کے خوگر ہوں، انہیں پُرامن، منظم اور عوامی تحریک کے لیے تیار کیا جائے۔ یہ تحریک دین کے نفاذ کے چاہنے والوں کی جانب سے تو پُرامن ہوگی مگر استعماری قوتوں کی جانب سے لازماً خونریز ہوگی۔ مگر منظم کارکنوں کا منکرات کے خلاف اُٹھ جانا باطل قوتوں کے لیے یقینی موت ہوگا۔ (ان شاء اللہ)

بقیہ: اداریہ

لئے جمہوری حکومت کا تختہ الٹنے کی ہمالائی غلطی کی۔ ظاہر ہے کہ امریکہ نے اپنے اصل عزائم تو مشرف پر ظاہر نہیں کیے ہوں گے لیکن اب صدر مشرف پر ساری صورتِ حال واضح ہوگئی ہوگی۔ اس امریکی سازش کو بے نقاب کرنے کی نہ مشرف میں جرأت ہے نہ اب یہ سودمند ثابت ہوگی، البتہ مشرف کے لئے کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ وہ اپنی اس سنگین غلطی کی تلافی اس طرح کریں جیسا کہ ہم ان صفحات میں انہیں پہلے بھی یہ مشورہ دے چکے ہیں کہ اب اپنی انگلز ڈکلیئر کر دیں وہ نوشتۂ دیوار پڑھ لیں، اپنی غلطی پر اصرار نہ کریں وگرنہ اُن کا انجام سابقہ فوجی آمروں سے بدتر ہوگا۔ غلطی چیف جسٹس چودھری افتخار سے بھی سرزد ہوئی تھی اُنہوں نے PCO کے تحت حلف اٹھایا لیکن بعدازاں اُنہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اُنہوں نے ازخود نوٹس کے ذریعے کئی افراد اور اداروں کو انصاف مہیا کیا خصوصاً لاپتہ افراد کی بازیابی کے لیے اُنہوں نے جہاد کیا۔ نجکاری کے حوالہ سے حکومتی عہدہ داروں کی لوٹ مار کے سامنے چٹان بن کر کھڑے ہوگئے۔ سٹیل ملز کی نجکاری کو خلاف قانون قرار دے کر حکومت کے منہ پر طمانچہ رسید کیا۔ اِس طرزِ عمل پر صدر مشرف نے حسب معمول فرعونیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے چیف جسٹس سے استعفیٰ طلب کر لیا لیکن چیف جسٹس اپنی سابقہ غلطی کو دہرانے پر تیار نہ ہوئے اور فرعونِ وقت کے سامنے اعلان بغاوت کر دیا۔ عوام کو اُن کی یہ ادا بھا گئی، وکلاء میدان میں نکل آئے۔ آہنی زنجیروں سے جکڑی عدلیہ آزاد ہوگئی۔ جسٹس منیر نے نظریۂ ضرورت ایجاد کر کے عدلیہ کو ذلت اور پستی کی جن اتھاہ گہرائیوں کی طرف دھکیل دیا تھا اور بعد میں آنے والے اِسی کو بنیاد بنا کر انصاف کا خون کرتے رہے عدلیہ کا پستی کی طرف یہ سفر 9 مارچ 2007ء کو ختم ہوگیا۔ ایک شخص نے آمریت کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر کے عدلیہ کے امیج کو اچھل سے آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ یہی موقع کسی نہ کسی حد تک ابھی بھی صدر مشرف کے پاس ہے۔ اُن کے دورِ حکومت میں فوج کا امیج بہت بُری طرح متاثر ہوا ہے۔ فوج کے خلاف جو نعرے جلسے جلوسوں میں لگے وہ دہرائے نہیں جا سکتے۔ صدر مشرف کا مکمل دستبرداری کا ایک اعلان اُنہیں زیرو سے پھر ہیرو بنا سکتا ہے۔ فوج کا امیج بھی بحال ہو جائے گا۔ ضرورت اِس امر کی ہے کہ وہ اپنی ذات سے اوپر اٹھیں یہ ملکی مفاد کی خاطر ایک معمولی قربانی ہے۔ وہ عالمی ماحول اور امریکی بھارتی اور اسرائیلی سازشوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ دشمن پاکستان کی فوج اور عوام کو لڑانا چاہتا ہے، عوام کی حمایت حاصل ہو تو فوج ایک دنیا کو فتح کر سکتی ہے اپنی ہی عوام فوج کی پشت پر نہ ہو تو ملک شکست وریخت سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ رہ گیا سوال ایٹمی قوت اور ایٹمی میزائلوں کا تو ہم سرکار کی خدمت میں عرض کیئے دیتے ہیں کہ ہمارے ایٹمی اثاثہ جات سویت یونین کی قوت سے کہیں کم ہیں لیکن سویت یونین ہماری نگاہوں کے سامنے چکنا چور ہوگیا۔ پھر دور کیوں جائیں کون نہیں جانتا کہ 1965ء میں بھارت ہمیں شکست نہ دے سکا لیکن 71ء میں جب فوجی آمریت کو عوام کی پشت پناہی حاصل نہ تھی تو ہمیں ہتھیار ڈالنے کی ذلت سے دوچار ہونا پڑا۔ صدر مشرف کہتے ہیں کہ زندگی میں کئی مرتبہ موت اُن کے سامنے آئی لیکن پھر اُس نے رخ موڑ لیا، اِس کا مطلب ہے کہ خدا اُن سے کوئی بڑا کام لینا چاہتا ہے، ہم اِس سے انکار نہیں کرتے کس وقت کسی کی اصلاح ہو جائے، کسی کا دل اور دماغ بدل جائے، یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ چور اور ڈاکو لحظہ بھر میں ولی اللہ بن گئے لیکن فی الحال صدر مشرف کے کرتوت بتاتے ہیں کہ اللہ اُنہیں بدترین انجام کی طرف لے جا رہا ہے بعض اوقات اللہ کسی کو اِس لیے اونچا لے جاتا ہے کہ زیادہ بلندی سے کھائی میں پھینکا جائے۔ صدر مشرف کو یہ سمجھنا چاہیے کہ فردِ واحد کی حکومت کا زمانہ نہیں رہا، اب عوام اور ملک کی ترقی کے لئے اجتماعی دانش درکار ہے اور یہ وقت کا فیصلہ ہے جس کے راستے میں آنے والا کچلا جائے گا یہ مسئلہ اہل یورپ کو بہت پہلے سمجھ آ گیا تھا، اِسی لیے اُنہوں نے چار سو سال پہلے پارلیمنٹ پر حملہ آور ہونے والے جنرل کرامویل کو قبر سے نکال کر پھانسی دی تھی۔ صدر مشرف کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ فوج کے چودھری افتخار بنیں گے یا ایشیا کے جنرل کرامویل، اُنہیں جان لینا چاہیے کہ تاریخ سے آنکھیں موندھ لینے والا اندھے کنوئیں میں جا گرتا ہے اور معاشرہ جب معرضِ انقلاب میں ہو تو راستہ روکنے والوں کی حیثیت طوفان کے سامنے گرے پڑے پتوں کی سی ہوتی ہے۔ 9 مارچ کو ایک نیا پاکستان جنم لے چکا ہے جس کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ جنرل صاحب دیر مت کریں وقت آپ کے ہاتھ سے نکل رہا ہے اور زمین آپ کے پاؤں کے نیچے سے کھسک رہی ہے۔

ترکی: فوجی اور سیاسی جماعتوں کی کشمکش

سید قاسم محمود

بعض حضرات نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ گزشتہ ہفتے ترکی میں نئے انتخابات کے تحت طیب اردگان کی قیادت میں اسلام پسند جماعت ''جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی'' نے جو غیر معمولی کامیابی حاصل کی ہے، ''ندائے خلافت'' میں ہم اپنے احیائے اسلام کی تحریکوں میں اُس کا ذکر کریں۔ قصہ یہ ہے کہ اِس سلسلے کے تحت تمام اسلامی ملکوں کی احیائی تحریکوں کا ذکر ہوتا رہا ہے۔ دو ممالک یعنی انڈیا اور ترکی میں احیائے اسلام کی تحریکوں کا حال خاص ہے۔ انڈیا میں مسلمانوں کی تعداد 10 فیصد اور ترکی میں 90 فیصد ہے۔ انڈیا میں کشمکش اور طرح کی رہی ہے اور ترکی میں معاملہ خلافت عثمانیہ کی تنسیخ کے بعد کسی اور طرح کا ہو گیا ہے۔ لہٰذا انڈیا کی تحریکوں کا ذکر بھی قدرے تفصیل سے ہُوا تھا، اور اب ترکی کی احیائی تحریکوں کا بیان بھی تفصیل سے اور سال بہ سال ہو رہا ہے۔ جب ہم 2007ء میں داخل ہوں گے تو جسٹس پارٹی کے موجودہ انتخابات میں شاندار کامیابی کا تذکرہ خود بخود ہو گا۔ (س ق م)

چیف آف جنرل سٹاف کنعان ایورن کی شہرت ایک بے داغ اور بے لوث فوجی افسر کی تھی۔ انہیں سیاستدان بھی عزت و احترام سے دیکھتے تھے۔ 1978ء میں بلند ایجویت نے انہیں فوج کا اعلیٰ عہدہ دیا تھا۔ جبکہ جنرل سمیع سانکار کو جسٹس پارٹی سے ہمدردی رکھنے کے شبے میں وزیراعظم نے ریٹائرڈ کر دیا تھا۔ 1980ء کے فوجی انقلاب سے پہلے کنعان ایورن نے نیشنل سیکیورٹی کونسل کے ذریعے سیاست دانوں سے تعاون کرنے کی اپیل کی تھی۔ 1982ء کے دستور کی روشنی میں آئندہ سال جو انتخابات ہوئے، اُس میں وہ صدرِ مملکت منتخب ہوئے۔

1982ء کا دستور مرتب کرنے والوں کا مقصد یہ تھا کہ زیادہ بااختیار انتظامیہ تشکیل دی جا سکے۔ سیاسی جماعتوں کے قانون اور انتخابات کے قواعد میں ایسی ترمیم کی جائے، جس سے زیادہ مستحکم حکومت بنائی جا سکے جو ملک میں امن و قانون کی بحالی پر قابو پا سکے۔ مخصوص حالات میں عام سیاسی حقوق سے محروم کر دینے کی قوت بھی حکومت کو دی گئی، مگر عوام کو بنیادی حقوق سے محروم قرار دینا اور اُن کی آزادی کو سلب کر دینا ہر حال میں ممنوع قرار پایا۔ دستور کی دفعہ میں اِس بات کا اضافہ کیا گیا کہ نیشنل سیکیورٹی کونسل زیادہ بااختیار ہو گی اور اس کے فیصلے کابینہ کو ترجیحی طور پر ملحوظ رکھنا ہوں گے۔ 1971ء کے دستور میں کونسل کو یہ حیثیت حاصل نہ تھی۔ وہ کابینہ کو اپنے بنیادی نظریات بطور سفارش پیش کر سکتی تھی اور بس۔ اب کونسل کابینہ کو ہر قسم کی ہدایت دینے کی مجاز ہو گئی اور کابینہ ترجیحی بنیادوں پر انہیں نافذ کرنے کی پابند ہو گئی۔ اِس طرح انتظامیہ میں فوج کا عمل دخل بہت بڑھ گیا۔

1971ء کے دستور کے مقابلے میں اب زیرِ بحث 1982ء کے نئے دستور میں بعض اختیارات میں کمی کی گئی۔ مثال کے طور پر مسلح افواج کے لیے یہ قانون منظور ہُوا کہ مسلح افواج میں کام کرنے والے پرائیویٹ افراد اور کارپورل اور ملٹری سکولوں کے طلبہ حق رائے دہی سے محروم ہوں گے۔ درحقیقت دفعہ 66 کے مطابق حق رائے دہی سے محروم اکیس سال سے اوپر کے صرف وہی لوگ تھے جو مجرم تھے اور جیلوں میں قید کی زندگی گزار رہے تھے۔ اب مزید لوگوں کو اِس بنیادی حق سے محروم کر دیا گیا۔

فوجی کمانڈر مسلح افواج کے حقوق کے تحفظ و دفاع کی خاطر صدرِ مملکت کے اختیارات کی توسیع کے حق میں تھے۔ اگرچہ اِس بات کی صراحت کہیں نہیں کی گئی کہ صدر کو فوج کا پس منظر رکھنے والے افراد میں سے منتخب ہونا چاہیے، بلکہ اسے پارلیمنٹ کی جانب سے کمانڈر انچیف کے دفتر کی نمائندگی کرنی تھی اور دفعہ 104 کے تحت صدر کو اختیار دیا گیا کہ وہ ترکی کی مسلح افواج کو جب اور جس طرح چاہے، حکماً استعمال کر سکتا ہے۔ چیف آف جنرل سٹاف کی تقرری کر سکتا ہے، نیشنل سیکیورٹی کونسل کا اجلاس طلب کر سکتا ہے اور مارشل لاء نافذ کر سکتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صدرِ مملکت کے توسط سے بھی فوج کے اختیارات بڑھا دیئے گئے، مگر کوئی ایسا طریقِ کار متعین نہیں کیا گیا، جس سے صدر مسلح افواج کی آزادی کو سلب کر لینے سے سیاست دانوں کو روک سکے یا حکومت کے روزمرہ معمولات کی انجام دہی سیاست دانوں کی صلاحیت و قوت میں مزاحم ہو سکے۔

نئی سیاسی پارٹیوں کی تشکیل

نیشنل سیکیورٹی کونسل نے نئے پارٹی سسٹم کی تشکیل کی، تاکہ 1980ء سے پہلے کی تمام سیاسی جماعتوں کو دوبارہ سیاست کی دہلیز پر قدم رکھنے سے روکا جا سکے اور انہیں نئے پرچم سے کام کرنے کا موقع نہ مل سکے، اور اب جو نئی سیاسی جماعتیں وجود میں آئیں، وہ فوج سے تصادم اور معرکہ آرائی نہ کریں۔ چنانچہ نئے دستور کے تحت حکومت کے رہنماؤں اور حزبِ اختلاف کے رہنماؤں کو بھی، دس سال تک جماعتی سیاست میں مصروف رہنے سے روک دیا۔ اسی طرح ممنوعہ سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے اراکین سینیٹ و قومی اسمبلی پر پانچ سال تک پارٹی سیاست میں سرگرم ہونے پر قدغن لگا دی گئی۔ لیکن یہ تمام پابندیاں 1987ء میں ہٹا لی گئیں۔

نئے دستور کی ایک اور دفعہ کے تحت ممنوعہ سیاسی جماعتوں کے بانیان، صدور، انتظامی کمیٹیوں کے ہر سطح کے ارکان، اور سیاسی جماعتوں کے پارلیمانی ارکان کسی نئی سیاسی جماعت کی بنیاد نہیں ڈال سکتے اور نہ اُس کی انتظامیہ کی رُکنیت اختیار کر سکتے تھے، نہ کوئی عہدہ قبول کر سکتے تھے۔ کوئی ایسی سیاسی جماعت تشکیل نہیں دی جا سکتی تھی، جس کے اراکین کی اکثریت کسی ایسی سیاسی جماعت سے متعلق رہی ہو، جسے فوجی حکومت نے 1981ء میں ممنوع قرار دے دیا ہو۔ یہ بندش 1987ء میں ختم کر دی گئی۔

دفعہ 96 کی رُو سے نئی سیاسی جماعتیں اُن سیاسی پارٹیوں کے نام، علامات اور پرچم وغیرہ استعمال نہیں کر سکتی تھیں جو 16 اکتوبر 1981ء کو ختم کر دی گئی تھیں۔ اُن پر یہ پابندی بھی عائد کر دی گئی تھی کہ وہ اِس امر کی صراحت کر سکیں کہ اُن کا تعلق 1981ء سے پہلے کی کسی سیاسی جماعت سے ہے۔ نیز سیاسی جماعتوں پر یہ پابندی بھی لگائی کہ وہ نیشنل سیکیورٹی کونسل کے فیصلوں اور پالیسیوں پر تنقید نہیں کریں گے۔

تمام پُرانی اور نئی سیاسی جماعتوں پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لیے نیشنل سیکیورٹی کونسل کو اختیار دیا گیا کہ اُن پر نظر رکھے اور بوقتِ ضرورت اُنہیں نااہل قرار دے دے۔ اس طرح کونسل کو یہ اختیار حاصل ہو گیا کہ اُس نے بہت سی سیاسی جماعتوں کو پہلے عام انتخابات میں شریک

ہونے سے روک دیا اور انہیں کسی اور سیاسی جماعت کی تائید وحمایت کرنے کی بھی اجازت نہیں دی۔

16 مئی 1983ء کو جیسے ہی سیاسی سرگرمیوں پر سے پابندی ختم ہوئی، ترکی سیاست کے سٹیج پر متعدد نئی سیاسی جماعتیں نمودار ہوئیں۔ ان میں سے ''نیشنلسٹ ڈیموکریسی پارٹی'' اور ''پاپولسٹ پارٹی'' کی تشکیل میں فوجی قیادت کی حوصلہ افزائی شامل تھی۔ یہ دونوں پارٹیاں علی الترتیب دائیں بازو اور بائیں بازو کی نمائندہ سمجھی جاتی تھیں۔ ''مدر لینڈ پارٹی'' ترگت اوزال کی سربراہی میں وجود میں آئی، جو پہلے جسٹس پارٹی حکومت کے انڈر سیکرٹری، اور پھر فوجی حکومت کے عہد میں دو سال تک نائب وزیراعظم کی حیثیت میں ''بین الاقوامی مالیاتی فنڈ (آئی ایم ایف) کے مطالبے پر کی گئی معاشی اصلاحات کے انچارج کی حیثیت سے معروف ہو چکے تھے۔ چوتھی قابلِ ذکر سیاسی جماعت ''گریٹ ترکی پارٹی'' تھی جس کی بنیاد ایک ریٹائرڈ جنرل علی فتحی نے رکھی تھی۔ پانچویں سیاسی جماعت ''سوشل ڈیموکریسی'' کے نام سے وجود میں آئی، جس کی سربراہی معروف سیاست دان عصمت انونو کے بیٹے اردل انونو کے ہاتھوں میں تھی۔ اسی وقت ''رفاہ پارٹی'' بھی نمودار ہوئی جس کے سربراہ پروفیسر نجم الدین اربکان تھے، جنہوں نے ملکی حالات کے پیش نظر ابتدا میں پس پردہ رہنا قرینِ مصلحت سمجھا۔ پھر جلد ہی اعلانیہ اس سے وابستہ ہوگئے۔ یہ پارٹی اسلام پسند مگر ممنوعہ جماعت ''ملی سلامت پارٹی'' ہی کا تسلسل تھی۔

''گریٹ ترکی پارٹی'' جو سابق جسٹس پارٹی ہی کو توسیع تھی اور اسی نام اور رجحان سے جلد ہی پہچانی جانے لگی اور اس کے رہنماؤں نے اِس تعلق و تسلسل سے نہ صرف فائدہ اٹھایا، بلکہ اس کا استحصال کرنے کا پلان بھی تیار کیا۔ یہ جماعت 31 مئی 1983ء کو خلافِ قانون قرار دے دی گئی، کیونکہ ''نیشنل سیکیورٹی کونسل'' کے سربراہ کسی قیمت پر 1980ء سے پہلے کی کوئی یادگار باقی رکھنے پر تیار نہ تھے۔ چنانچہ اِس جماعت کے رہنماؤں نے ''ٹروتھ پارٹی'' کے نام سے ایک نئی سیاسی جماعت تشکیل دے ڈالی، مگر 1983ء کے عام انتخابات میں یہ پارٹی شریک نہ ہوسکی۔

''سوشل ڈیموکریسی پارٹی'' بھی جو معطل رہی پبلیکن پیپلز پارٹی کا خلاء پُر کرنے کا عزم لے کر اٹھی تھی، اِس عام انتخابات میں حصہ نہ لے سکی۔ البتہ مدر لینڈ پارٹی نے جوش وخروش سے الیکشن میں حصہ لیا اور ترگت اوزال نے ایک ماہر سیاست دان کی حیثیت سے 1983ء کے الیکشن میں فتح حاصل کر لی۔ انتخابات سے قبل ''نیشنل سیکیورٹی کونسل'' نے 12 جون 1983ء کو انتخابی امیدواروں کو مسترد اور نااہل قرار دینے کا اختیار حاصل کر لیا۔ چنانچہ کونسل نے نومبر 1983ء کے الیکشن سے پہلے مدر لینڈ پارٹی کے 292 امیدواروں نیشنلسٹ ڈیموکریسی پارٹی کے 398، اور پاپولسٹ پارٹی کے 389 امیدواروں کو مسترد کر دیا۔

رفاہ پارٹی کی اسلام پسندی

رفاہ پارٹی درحقیقت قومی شعور کی حامل اور اسلام کی عظمتِ رفتہ کی بحالی کے لیے وجود میں آئی تھی۔ یہی مقصد ''ملی سلامت پارٹی'' کا بھی تھا، جسے 1980ء کے فوجی انقلاب نے تحلیل کر دیا تھا۔ یہ پارٹی مادی ترقیوں سے زیادہ رُوحانی ارتقا پر زور دیتی تھی، جس کے بغیر مادی ترقیاں بے معنی ہیں۔ پارٹی تہذیبی وثقافتی پہلوؤں پر زیادہ توجہ صرف کرتی تھی۔ اِس پارٹی کے رہنماؤں کے نزدیک پچھلی صدی میں جدیدیت اور مغربیت کی تحریک اس لیے ناکام ہوئی کہ اس میں روحانیت کا فقدان تھا۔ ترکی صنعتی دوڑ میں باقی دنیا سے اس لیے پیچھے رہ گیا تھا کہ اُس نے خارجی افکار ونظریات اور خارجی وسائل پر بھروسا کیا تھا۔ مغربی تہذیب، فکر وثقافت اور مغربی طرزِ زندگی کی درآمد نے ملک میں اخلاقی وتہذیبی بحران پیدا کر دیا، جس سے قومی زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی۔ اس کے فکر ونظر کے سوتے خشک ہوگئے اور پوری قوم اغیار پر تکیہ کر کے خود کفالتی اور خود انحصاری کا جذبہ کھو بیٹھی۔

رفاہ پارٹی کے مطابق مادیت کی چمک دمک اور روحانیت کے فقدان نے آج دنیا کو اضطرابات وفسادات، جنگ وجدال، تشدد ودہشت گردی، ظلم واستحصال، غربت و افلاس اور مایوسی ونامرادی میں مبتلا کر دیا ہے۔ انسانیت روحانی واخلاقی زندگی سے دُور ہو چکی ہے۔ فحاشی وبدکاری عام ہے۔ منشیات اور جرائم نے نوجوانوں کی قوت وصلاحیت سلب کر لی ہے۔ دماغی وقلبی امراض عام ہوگئے ہیں۔ طرح طرح کی نفسیاتی بیماریاں پھیل رہی ہیں اور انسانوں نے محبت واخوت، امن وامان، بقائے باہمی، قوتِ برداشت، رواداری، صداقت وامانت کی جن اقدار کی تعلیم حاصل کی تھی، وہ عنقا ہوتی جا رہی ہے۔ اب ایک نئے شعور کی ضرورت ہے جو مادی زندگی کو اعلیٰ روحانی واخلاقی اقدار کے سایے میں پروان چڑھائے۔ یہ نیا شعور کیا ہے؟ اور اس کا اسلام سے کیا تعلق ہے؟ ان سوالوں پر رائے زنی کرتے ہوئے ''رفاہ پارٹی'' کے رہنماؤں نے ملکی (اور فوجی) دباؤ میں احتیاط سے کام لیا، مگر مخاطب سمجھ رہے تھے کہ ان اقدار کے احیاء کا مطلب اسلامی نظام کا احیاء ہے۔

رفاہ پارٹی نے ترکی میں بھاری صنعتیں لگانے کا اعلان کیا، تاکہ ترکی میں معیشت کے میدان میں جو عدمِ توازن پیدا ہو گیا ہے، اُسے درست کیا جا سکے اور مختلف طبقات کے درمیان موجودہ زبردست معاشی تفاوت کو ختم کیا جا سکے۔ اُس نے آزاد خارجہ پالیسی مرتب کرنے کا بھی اعلان کیا، جس سے ترکی اپنے افرادی وسائل اور صلاحیتوں کا صحیح استعمال کرنے کے قابل ہو سکے۔ اس سلسلے میں پارٹی نے اس موقف کا اعادہ کیا کہ اُن ممالک سے مستحکم روابط قائم کیے جائیں گے جن کے روحانی وثقافتی اور تاریخی تناظر میں اشتراک پایا جاتا ہے، یعنی مشرقِ وسطیٰ اور عالمِ اسلام سے۔

1989ء میں پروفیسر نجم الدین اربکان نے بتایا کہ بلدیات کے حالیہ انتخابات میں رفاہ پارٹی کی کارکردگی نسبتاً بہتر رہی ہے۔ اُس وقت 80 بلدیات پر رفاہ پارٹی کا قبضہ تھا۔ اُن میں نمایاں ترین قونیہ، سیواس، اورفہ، وان اور مرعش کی بلدیات تھیں۔ قونیہ کے چیئرمین نے کامیاب ہوتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ طالبات کے لیے الگ بسیں جاری کر دیں۔ اس پر لادین اور سیکولر طبقے نے بڑا ہنگامہ کیا۔ اخبارات میں ہنگامہ بپا ہو گیا اور کہا جانے لگا کہ قونیہ میں اسلامی ریاست قائم ہوگئی ہے، لیکن قونیہ کے عوام نے اس فیصلے پر بڑی خوشیاں منائیں۔ بلدیہ سیواس کے چیئرمین نے سینماؤں کے سامنے عریاں تصاویر لگانے پر سخت پابندی عائد کر دی۔ بلدیہ اورفہ کے چیئرمین نے بیان دیا کہ مجھے مصطفیٰ کمال پاشا سے کوئی عقیدت نہیں ہے۔ اس پر یہود نواز حلقے برہم ہوگئے۔ ترکی کی خفیہ پولیس اُنہیں گرفتار کر کے انقرہ لے گئی اور کئی گھنٹے کی پوچھ گچھ کے بعد انہیں رہا کیا گیا۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ میرا ضمیر مصطفیٰ کمال کو ناپسند کرتا ہے اور میرے ضمیر پر کوئی پابندی عائد نہیں کر سکتا۔

(جاری ہے)

بلدیہ اورفہ کے چیئرمین نے بیان دیا کہ مجھے مصطفیٰ کمال پاشا سے کوئی عقیدت نہیں ہے۔ اس پر یہود نواز حلقے ترکی کی خفیہ پولیس اُنہیں گرفتار کر کے انقرہ لے گئی، انہوں نے صاف کہہ دیا کہ میرا ضمیر مصطفیٰ کمال کو ناپسند کرتا ہے اور میرے ضمیر پر کوئی پابندی عائد نہیں کر سکتا

دعائے صحت کی اپیل

☆ تنظیم اسلامی شاہ فیصل / ملیر کے امیر محترم جناب اعجاز لطیف کے والد شدید علیل ہیں۔

☆ تنظیم اسلامی صادق آباد کے حکیم جماعت علی گردوں کے مرض اور ڈاکٹر طاہر ابرار عارضۂ قلب میں مبتلا ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان سب کو صحت کاملہ وعاجلہ عطا فرمائیں۔

جکارتہ کانفرنس اور خلافت کا احیاء

محمد سلیم قریشی

زوال اور ادبار کی بدترین سطح کو چھو لینے کے بعد سیاسی، ثقافتی، تعلیمی غرض ہر حوالے سے عالم اسلام میں بیداری کا ایک عمل کسی نہ کسی درجے میں شروع ہو چکا ہے۔ ماضی سے پرجوش تعلق قائم رکھتے ہوئے آگے کی طرف جانے کا عمل دنیا کے مختلف ممالک اور براعظموں میں رہنے والے مسلمانوں میں حیرت انگیز مماثلت کے ساتھ جاری ہے۔ امت مسلمہ میں ہمہ جہت بہتری اور بیداری کے اشارے مل رہے ہیں۔ اتوار 12 اگست کو انڈونیشیا کے دارالحکومت جکارتہ میں ایک لاکھ کے لگ بھگ اجتماع میں مسلم دنیا میں خلافت کے احیاء کا مطالبہ کیا گیا۔ مظاہرین نے اسلامی ریاست کے قیام اور اللہ اکبر کے نعرے لگائے۔ اجتماع کی خاص بات خواتین کی بڑی تعداد میں شرکت تھی۔ مقامی اور غیر ملکی مقررین نے واضح کیا کہ خلافت کے قیام کی بنیاد مسلمانوں کے اتحاد میں ہے۔ ہمیں روز حساب سرخرو ہونے کے لئے دنیا کے ہر گوشے میں خلافت کا پیغام پہنچانا ہوگا اور ایک بار پھر پوری دنیا میں اسلامی ریاست اور خلافت کا نظام قائم کرنا ہوگا۔ بین الاقوامی نشریاتی اداروں، مغربی میڈیا اور ذرائع ابلاغ نے اس کانفرنس کو نمایاں کوریج دی اور امت مسلمہ کی بیداری کے آغاز سے تعبیر کیا۔

عظیم الشان افرادی قوت، پچاس سے زائد آزاد اور خودمختار ممالک کے بے پناہ وسائل اور ذرائع کے ہوتے ہوئے بھی دنیا کا ایک پسماندہ اور بے وقعت انسانی گروہ، تمام تر کوتاہیوں کے باوجود اسلام کی صورت میں ایک ایسے دین کا علمبردار ہے جس میں عالمگیر اخوت انسانی کا پیغام بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ عصر حاضر میں دنیا ایک نئے عالمی نظام کی تلاش میں ہے۔ مغرب نے دنیا کو جو نظریۂ حیات دیا ہے اس کا دارومدار استحصال بالجبر، مفاد پرستی اور ارتکاز دولت پر ہے جس میں اخوت انسانی کی گنجائش نہایت محدود ہے۔ مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام نے آفاقیت کے جس تصور کو عالمگیریت کے ناروا اور استحصالی تصور میں تبدیل کر دیا۔ مغرب کے پالیسی ساز اور دانشور اس نظام عالم کے لئے اگر کسی ضابطۂ حیات کو حقیقی خطرہ سمجھتے ہیں تو وہ اسلام ہے، کیونکہ اسلام ہی وہ طرز زندگی ہے جس نے فکری، علمی اور تہذیبی حوالے سے انسانی تاریخ کو سب سے زیادہ فعال اور مثبت انداز میں متاثر کیا ہے۔ اسلام تمام تعمیری اور مثبت رجحانات کے ساتھ انسانیت کو سیراب کرنے اور موجودہ استحصالی نظام کو پامال کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتا ہے۔ ضعف اور انحطاط مسلمانوں میں آیا ہے، اسلام میں نہیں۔ باطل قوتیں اسلام کے اہم ترین اور باقی مذاہب سے الگ کرنے والے اسلام کی حاکمیت کی واپسی کے جس پہلو سے محروم کرنا چاہتی ہیں وہ اسلام کی حاکمیت کی واپسی کے جس پہلو سے محروم کرنا چاہتی ہیں وہ اسلام کا سیاسی نظام اور انتظام ریاست ہے۔ اللہ رب العزت کے نازل کردہ احکامات کے مطابق امت مسلمہ کے معاملات کی انجام دہی اور اسلام کے جامع اور ہمہ گیر نظام کو پوری دنیا میں پہنچانے کے لئے خلافت کے نظام کا قیام، جسے رسول اکرم ﷺ نے اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کی ہدایت کی روشنی میں قائم فرمایا۔ یہ نظام مملکت نسل انسانی کے Ideals اور معیار فکر و نظر کو معاشرتی حقیقت میں ڈھالنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جو رسول اکرم ﷺ کے عہد مبارک اور اس سے متصل اور خلافت راشدہ تک تمام خوبیوں کے ساتھ بھرپور انداز میں برقرار رہا اور ثابت کرتا رہا کہ خلافت محض نظریہ یا خواب نہیں ایک عملی حقیقت ہے۔

خلافت محض ایک ''روحانی مذہبی'' ریاست (تھیولاجیکل اسٹیٹ) نہیں۔ اسلام کے نظام فکر و عمل میں عبادات کے ساتھ ساتھ ایک مکمل نظام معاشرت بھی موجود ہے جو نظم مملکت میں ڈھل کر نوع انسانی کی رہنمائی کے لئے تا ابد عطا کیا گیا ہے۔ خلافت راشدہ تک اس عہد کی برقراری اس امر کی نشاندہی ہے کہ تمام محاسن کے ساتھ اس نظام کا قیام نبی آخر الزماں ﷺ کی اُمت پر بھی فرض ہے۔ اس مملکت کا دستور ارشادات قرآنی کی صورت میں زمان و مکان کی قید سے بے نیاز ہر عہد میں قابل عمل ہے اور تمام انسانی مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔

نظام خلافت کی شکل میں اسلام ایک ایسا معاشرہ ترتیب دیتا ہے جو اپنے افکار، جذبات، قوانین اور افراد کی شخصیت کے لحاظ سے ایک منفرد معاشرہ ہے جس میں مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ تمام تر جامعیت اور اعلیٰ صلاحیتوں کے ساتھ بروئے کار آتی ہے۔ خلافت کا نظام حکومت دنیا میں موجود تمام نظام ہائے حکومت سے مختلف ہے۔ اس نظام میں حکومت کی شکل بادشاہت نہیں ہے۔ اسلام بادشاہی طرز حکومت کو تسلیم کرتا ہے اور نہ ہی اس سے مشابہت رکھتا ہے۔ بادشاہی نظام میں حکومت موروثی ہوتی ہے اور بادشاہ کو خصوصی حقوق اور امتیاز و استثناء حاصل ہوتا ہے جو رعایا میں کسی اور کا استحقاق نہیں۔ خلافت کے نظام میں نہ تو ولی عہد کا تصور ہوتا ہے اور نہ ہی بادشاہ خصوصی حقوق کا حقدار ہوتا ہے۔ بیشتر مماثلتوں کے باوجود خلافت درحقیقت جمہوری نظام بھی نہیں ہے۔ جس میں لوگوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ قانون سازی کریں، دستور و قوانین مرتب کریں، منسوخ کریں یا پھر ان میں کوئی ردوبدل کریں۔ خلافت کی بنیاد اسلامی عقیدے اور احکام شرعیہ پر ہے اور اقتدار اعلیٰ شریعت کو حاصل ہے امت کو نہیں۔ نہ تو افراد اور نہ ہی خلیفہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ قانون سازی کریں، قانون ساز صرف اللہ کی ذات ہے اور خلیفہ کو صرف اتنا اختیار حاصل ہے کہ وہ کتاب و سنت سے اخذ کردہ احکامات کو دستور و قوانین مرتب کرنے کے لئے اختیار کرے۔ خلافت کا نظام نو آبادیاتی بھی نہیں ہے۔ نو آبادیاتی نظام اسلام سے بالکل میل نہیں کھاتا۔ نو آبادیاتی نظام میں سلطنت کے مختلف حصوں میں بسنے والے مختلف نسل کے لوگوں سے یکساں سلوک نہیں کیا جاتا جبکہ اسلامی طرز حکومت میں ریاست کے تمام خطوں میں بسنے والے لوگوں کو مساوی حقوق حاصل ہوتے ہیں اور نسلی تعصب کی ممانعت ہوتی ہے۔ خلافت کا طرز حکومت وفاقی طرز کا بھی نہیں ہے جس میں مختلف علاقوں کو خودمختاری حاصل ہوتی ہے لیکن وہ ایک عمومی مرکزی حکومت کے ذریعے باہم متحد ہوتے ہیں مگر خلافت میں ریاست کے کسی حصے کو خودمختاری کی اجازت نہیں تاکہ ریاست کے حصے بخرے نہ ہوں۔ الغرض خلافت یا اسلامی نظام حکومت اپنے ماخذ اور اساس کے حوالے سے دیگر تمام نظام ہائے حکومت سے مختلف ہے، اگرچہ اس کے بعض پہلو دیگر حکومتی نظاموں کے بعض پہلوؤں سے مطابقت رکھتے ہیں۔

ناقدین اعتراض کرتے ہیں کہ خلافت کا نظام شفاف اور واضح نہیں اور موجودہ عہد کے تقاضوں کی تکمیل سے قاصر ہے۔ جو لوگ خلافت کے قیام کی دعوت لے کر اٹھے ان کا انداز بھی عمومی اور اسلام کی حاکمیت سے متعلق نہیں تھا۔ امت میں ایک گروہ نے اس صورتحال کا جائزہ لیتے ہوئے دنیا کو آگاہ کیا کہ خلافت پسماندہ نظام نہیں ہے بلکہ تمام جزئیات کے ساتھ موجودہ عہد کے مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔ لامحدود دانائی کی بنیاد سے اخذ کردہ نظام خلافت کا قیام فقہائے اُم الفرائض قرار دیا ہے جیسا کہ رسول اکرم ﷺ کی اس حدیث میں ارشاد فرمایا ہے۔ ''تم میں نبوت باقی رہے گی جب تک اللہ چاہے گا پھر اللہ اس کو اٹھالے گا، پھر خلفائے راشدین کا دور آئے گا اور یہ باقی رہے گا جب تک اللہ چاہے گا، پھر اللہ اس کو اٹھالے گا، پھر کاٹ کھانے والی بادشاہتوں کا دور آئے گا اور یہ باقی رہیں گی جب تک اللہ چاہے، پھر اللہ ان کو اٹھالے گا پھر جابر بادشاہوں کی حکومتیں ہوں گی اور یہ باقی رہے گی جب تک اللہ چاہے، پھر اللہ اس کو اٹھالے گا اور پھر تم میں دوبارہ خلافت علی منہاج النبوۃ قائم ہوگی اور اس کے بعد رسول اللہ ﷺ خاموش ہو گئے۔

(بشکریہ روزنامہ ''جنگ'')

تحریکی کارکنوں کے لئے لمحۂ فکریہ

سلمیٰ یاسمین نجمی

بہت دنوں سے ایک سوال بار بار ذہن میں آتا ہے کہ بحیثیت ایک تحریکی کارکن اور رکن کے ہماری سیرت و کردار کیا ہونا چاہیے؟ ہم نے ایک تحریک سے خود کو وابستہ کیا ہے جو اسلامی انقلاب کا خواب دیکھ رہی ہے۔ اس کے ارکان اور کارکنان کو باقی لوگوں سے مختلف اور منفرد ہونا چاہیے۔ ہم بہتر ہوں گے تو دعوت مؤثر ہوگی۔ ہم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے کے دعویدار ہیں تو دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ فریضہ ہم اپنی ذات پر بھی ادا کر رہے ہیں یا نہیں۔ ہم نے اصلاحِ معاشرہ کا بیڑا اُٹھایا ہے تو اگر ہماری اپنی ذات ہی کی اصلاح نہیں ہوسکی تو کسی اور کی کیا کریں گے۔ اگر ہم ویسے ہی ہیں جیسے کہ معاشرے کے باقی افراد، تو پھر ہم کسی اسلامی تحریک کے رکن کہلائے جانے کے مستحق نہیں ہیں۔

دعوتِ دین کا کام دراصل نیابت الٰہی کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں امت وسط بنایا اور ہم سے روزِ قیامت گواہی لی جائے گی، تو پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نائب کی سیرت و کردار کیا ہونا چاہیے۔ اور یہ کہ کیا ہم اس اہم منصب کے قابل بھی ہیں یا نہیں۔ اور کیا ہم اپنی خامیوں سے آگاہ ہیں؟ اگر ہیں تو اس سلسلے میں ہم کیا کرتے ہیں اور اگر کوئی دوسرا ان کی نشاندہی کرے تو مشتعل ہو جاتے ہیں یا شکر گزار ہوتے ہیں۔

ایک رویہ یہ بھی ہے کہ ہمیشہ خود کو برحق سمجھنا، اور اختلاف کرنے والے کو غلط سمجھنا، اپنے بارے میں یہ تصور کرنا کہ ہم جو کہہ رہے ہیں وہی ٹھیک ہے۔ دوسروں کی بات کو اہمیت نہ دینا بہت غلط رویہ ہے۔ کیونکہ کوئی شخص بھی عقل کل ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ سوائے انبیاء علیہم السلام کے کوئی بھی معصوم عن الخطا نہیں ہے۔

دیکھیے! سیدھی سی بات یہ ہے کہ اگر ہم بھی باقی ساری دنیا کی طرح ہیں اور ہم اپنی اور اپنے گھر والوں کی زندگی میں کوئی انقلاب نہیں لا سکتے تو پھر ہم اسلامی انقلاب کیسے لا سکتے ہیں۔ معاشرے کو کیسے بدل سکتے ہیں۔ کوئی معرکہ کیسے مار سکتے ہیں۔ ابھی تو ہم اپنی ذات کی تنگ گلیوں سے ہی باہر نہیں آئے۔

میں نے جب ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے کے لیے اپنا اور اپنے گرد و پیش کے لوگوں کا جائزہ لیا تو دکھ اور مایوسی کا شکار ہوگئی۔ اس لیے کہ مجھے تحریک کے لوگ بھی عام لوگوں جیسے ہی لگے۔ کوئی خاص بہتری اور برتری نظر نہیں آئی۔ بلکہ دوسرے لوگ بعض معاملات میں ہم سے بہتر ہیں۔ محض پردہ کر لینا، داڑھی رکھ لینا اور ظاہری عبادات کا اہتمام کر لینا کافی نہیں ہے۔ یہ کام تو بے شمار دوسری مسلمان خواتین اور حضرات بھی کر رہے ہیں۔ خواتین ہم سے زیادہ اچھا پردہ کرتی ہیں۔ فرائض کے معاملے میں ہم سے زیادہ مستعد ہیں۔ وہ نوافل کا اہتمام کرتے ہیں، خدمت خلق کے لیے جان لڑاتے ہیں۔ اصل چیز معاملات ہیں۔ جب کوئی کرائسس آتا ہے تو وہ کسوٹی کا کام کرتا ہے۔ کھرے اور کھوٹے کی پہچان ہو جاتی ہے۔ اس وقت پتہ چلتا ہے کہ زرِ خالص کتنا ہے اور اس میں کھوٹ کتنی ہے۔ تمام دعوؤں کی قلعی اتر جاتی ہے اور اندر سے وہی کچھ برآمد ہوتا ہے جو اصل میں ہم ہوتے ہیں۔

حقوق اللہ تو جیسے تیسے ہم پورے کر ہی لیتے ہیں، مگر

افسوس کہ میں نے کئی ارکان کو نفرت سے لت پت اور حسد کی آگ میں جلتے بھنتے دیکھا ہے۔ شعلہ اگلتی زبانوں کو سنا ہے۔ چپکے چپکے لوگوں کی جڑیں کاٹتے دیکھا ہے۔ کیا تحریکی ارکان یا کارکنان کو ایسا ہونا چاہیے؟

حقوق العباد کے معاملے میں ہم بہت کوتاہ قد ہیں، پاسنگ مارکس بھی نہیں مل سکتے۔ مکمل ناکام۔ کسی سے بھی اختلاف اگر ہو جائے تو ہمارا ردِ عمل، ہمارا معاملہ ایک دینی جماعت کے رکن کے شایانِ شان نہیں ہوتا۔ ہمارے قول و فعل کا تضاد اتنا نمایاں ہوتا ہے کہ انسان ششدر رہ جاتا ہے۔ ہمارے ہاں درگزر، معافی، صبر نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ وہ جو میرے رب نے مجھے نو باتوں کا حکم دیا ہے، جس کے طغرے ہم نے اپنے گھروں میں سجا رکھے ہیں اور دوستوں کو بھی دیتے رہتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ انھیں اپنے دل کی دیوار پر آویزاں کرلیں۔ وہی ہمارے محاسبے کے لیے کافی ہیں۔

اپنے خاندان، برادری، سمدھانے، سسرال اور میکے والوں سے ہمارے تعلقات ہرگز قابل رشک نہیں ہیں، بلکہ صلہ رحمی کی تو ابجد سے بھی واقف نہیں ہیں۔ قطع رحمی کی سزا جانتے ہیں، اس کے باوجود اُن روابط کو بڑی آسانی سے کاٹتے رہتے ہیں جن کے جوڑنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ جس سے ناراض ہوئے، اس کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیے۔ رفوگری کے فن سے قطعی ناآشنا ہیں۔ پھر جھوٹے سچے الزامات، بہتان تراشی، غیبت، بدزبانی، کون سی ایسی برائی ہے جو ہم سے سرزد نہیں ہوتی۔ دوسروں کو تو نصیحت کرتے ہیں کہ کسی مومن کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ خفا رہے، اور ہماری ناراضگیاں سالوں پر محیط ہوتی ہیں۔ سلام کا جواب دینا بھی گوارا نہیں ہوتا۔ گویا معافی کا لفظ ہماری لغت میں ہے ہی نہیں۔ دوسری جانب روزانہ اللہ کے سامنے گڑگڑاتے رہتے ہیں۔ اللھم انك عفو تحب العفو فاعف عنی۔ جب ہم خود معاف کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے تو پھر اللہ تعالیٰ سے کس منہ سے معافی طلب کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے، ہمارے درسوں سے متاثر ہو کر بہت سے لوگوں نے معاف کرنا سیکھا ہوگا، کئے ہوؤں کو جوڑا ہوگا، مگر ہم اس صفت سے محروم رہے۔

افسوس کہ میں نے کئی ارکان کو نفرت سے لت پت اور حسد کی آگ میں جلتے بھنتے دیکھا ہے۔ شعلہ اگلتی زبانوں کو سنا ہے۔ چپکے چپکے لوگوں کی جڑیں کاٹتے دیکھا ہے۔ کیا تحریکی ارکان یا کارکنان کو ایسا ہونا چاہیے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ حسنہ پر تقریریں کرنے والوں کا اپنا اخلاق اتنا پست ہونا چاہیے؟ نرمی، مٹھاس، لحاظ اور خوش خلقی کے بجائے بدلحاظی، بداخلاقی، سنگ دلی، سختی اور اکھڑپن کے مظاہرے کسی بھی انسان کو زیب نہیں دیتے۔ آپ لوگ بے شمار لوگوں کے لیے رول ماڈل ہیں۔ کیا رول ماڈل ایسے ہونے چاہئیں؟

کبھی کبھی دینی تکبر کی جھلکیاں بھی نظر آجاتی ہیں۔ اپنے مسلک پر اصرار کرنا اور اس کو دوسروں پر ٹھونسنا نامناسب رویہ ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ حضرات یا خواتین یہ بتانے کی کوشش کر رہی ہیں کہ دین کو جیسے ہم نے سمجھا ہے بس وہی برحق ہے۔ دوسرے لوگ بے وقوف ہیں، نادان ہیں۔ آخر چاروں اماموں میں بھی اختلاف رائے تھا۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ اُن میں سے کوئی غلط تھا۔ اور سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ ہم سب نے مولانا مودودیؒ کو قرآن، حدیث اور سنت کے بعد اپنا رہنما کیا ہے تو ہمیں اُن کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اور اُن سے اختلاف رائے کرنے سے پہلے یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ کیا ہم علم کے اعتبار سے اُن کے مدمقابل ہیں؟

ایک اور خامی جو اب بڑھتی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے اندر مادہ پرستی اور دنیاداری آہستہ آہستہ نامعلوم طریقے سے سرایت کرتی جا رہی ہے۔ خاندانی رسم و رواج اور ریتوں رسموں کے جنگل سے اب تک ہم نکل نہیں پائے ہیں۔ ممکن ہے ایسا شعوری طور پر نہ ہو رہا ہو۔ بلکہ دنیا کا چلن ہی ایسا ہوگیا ہے۔ لہٰذا وہ دبے پاؤں ہمارے اندر بھی گھس آئی ہو۔ مؤمن کی تعریف یہ ہے کہ اس کے مقاصد جلیل اور اس کی امیدیں قلیل ہوتی ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے مقاصد تو اب بھی جلیل ہیں مگر امیدیں قلیل نہیں رہیں۔ ہمیں بھی وہی کچھ چاہیے جو ایک عام دنیا دار آدمی کی خواہش ہوتی ہے۔ ہمارے بچے بھی بس دنیاوی تعلیم حاصل کریں اور مغربی ملکوں میں جا بسیں۔ زیادہ سے زیادہ دولت کے حصول کی خواہش بھی سر اُٹھاتی رہتی ہے۔ ہم دنیاوی آسائشیں حاصل کرنے کے لیے چادر سے باہر نکلے جا

رہے ہیں۔ قناعت نہیں رہی۔ سادگی اگر کہیں نظر آتی بھی ہے تو وہ خود اختیاری نہیں ہے بلکہ مجبوری کی ہے کہ اتنے وسائل ہی نہیں ہیں کہ شان بگھاری جا سکے۔ بات تو تب ہے کہ جب آدمی کے پاس بہت کچھ ہو، مگر وہ اپنی حد کے اندر رہے۔

آپ شادی بیاہ دیکھ لیجیے۔ ایک صرف مہندی، مووی کیمرہ اور فوٹو سیشن کو چھوڑ کر وہاں وہ سب کچھ دیکھنے کو ملتا ہے جو ایک عام دنیا دار گھر میں ہوتا ہے۔ رہی بیوٹی پارلروں کی سجی سنوری دلہنیں، وہی سینوں سے ہٹے ہوئے آنچل، پردے کے اہتمام کی کمی، بہت ساری ڈشوں سے سجی میزیں، جہیز یا بری کے ڈائریکٹ یا اَن ڈائریکٹ مطالبات، اور اگر خدانخواستہ کہیں رشتہ یا شادی ٹوٹ جائے تو پھر الاماں والحفیظ۔ ایک دوسرے پر الزامات اور بہتانوں کی بارش، کردار کشی، دھمکیاں۔ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنا، ایک دوسرے کے سامان پر قبضہ کرنا، واپسی میں لیت ولعل سے کام لینا، شک، بدگمانیاں، غرضیکہ ایسے کردار کا مظاہرہ کرنا جو ایک خوف خدا رکھنے والے کو قطعی زیب نہیں دیتا۔ تہذیب و شائستگی، وقار اور عدل کے ساتھ بھی معاملات کو نمٹایا جا سکتا ہے مگر یہ تو تب ہو جب دین ہم میں راسخ ہوتا، ایمان ہمارے رگ و پے میں اتر چکا ہوتا، اور ہم دوسروں سے مختلف ہوتے۔

ایک اور اہم بات یہ کہ ہم درس و تدریس میں اتنے منہمک ہو جاتے ہیں کہ گھر کا دھیان نہیں رہتا۔ اپنے بچوں پر توجہ کم ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ بعض اوقات غلط راستوں پر چل نکلتے ہیں۔ اکثر ارکان کی اولاد اُن کی ہم خیال نہیں ہے۔ نہ اُن کے خیالات، نہ اُن کے چلن، نہ اُن کے لباس، کسی پر بھی ہمارے نظریات کی چھاپ نظر نہیں آتی۔ جیسے باقی بچے ہیں وہ بھی ویسے ہیں۔ بچے فطرتِ صالح پر پیدا ہوتے ہیں۔ ہم انہیں جو کچھ بنائیں گے، وہ وہی بنیں گے۔ اور اگر توجہ نہیں کریں گے تو خودرَو پودوں کی طرح کوئی اچھا نکل جائے گا اور کوئی جھاڑ جھنکار بن جائے گا۔ اچھا نکلنے والا اس لیے اچھا ہوگا کہ اس کی فطرت اور مزاج میں اچھائی کی طرف رجحان ہوگا اور دوسرے باہر کی سوسائٹی کے دباؤ کی وجہ سے اُن کے رنگ میں رنگ جائیں گے۔

والدین کوزہ گر ہوتے ہیں۔ اگر وہ اپنی کوزہ گری میں کوتاہی کے مرتکب ہوں گے تو نتائج بھی ویسے ہی ہوں گے۔ ہمیں ضرور اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ ہم سے کہاں خطا ہوئی۔ کون سی بھول ہوئی۔ کیا کمی بیشی رہ گئی۔ کیا ہم اپنے بچوں سے ڈر گئے، دَب گئے، اُن کے سامنے بے بس ہو گئے؟ اگر ہم اپنے آپ سے جنم لینے والوں سے ہار گئے، اُن کو بدل نہ سکے تو پھر پوری دنیا کو کیسے بدلیں گے۔ بعض اوقات ہماری بے جا سختیاں بھی اُن کو ہمارے مشن سے متنفر کر دیتی ہیں۔ بہرحال، اپنی اولاد کو باعث عزت اور باعث ننگ بنانا کافی حد تک ہم پر منحصر ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارے قول و فعل میں تضاد نہیں ہونا چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ اُن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پیدا کرنی چاہیے۔ بلکہ برین واش کر دینا چاہیے۔ تیسری بات یہ کہ بچوں کے معاملے میں اتنا حساس نہیں ہونا چاہیے کہ اگر کوئی اُن کی کسی خامی کی طرف اشارہ کر دے تو شکر گزار ہونے کے بجائے اُلٹا جھاڑ کے کانٹے کی طرح اُس کے پیچھے لگ جائیں۔ آج کے بچے دوہری شخصیت کے مالک ہیں۔ ایک وہ شخصیت جو گھر میں ہوتی ہے اور دوسری وہ جو تعلیمی اداروں اور دوستوں اور سہیلیوں کے سامنے ہوتی ہے۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

تو ان بازی گروں پر پوری توجہ کریں۔ ان کی چمک اور آب و تاب کو بڑھائیں، قائم رکھیں۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ دوسروں کے گھروں میں اجالے بکھیرتے رہیں اور اپنے آسمان کے ستارے ٹوٹتے رہیں، ڈوبتے رہیں یا اُن کی روشنی ماند پڑتی رہے۔

چوتھی بات یہ کہ ہماری پہلی ذمہ داری ہمارا اپنا گھر ہے، اپنے بال بچے ہیں۔ پھر اپنے قریبی اعزہ اور ارحام ہیں۔ پھر ہمسائے، اس کے بعد دوسروں کا نمبر آتا ہے۔ جس ترتیب سے ہمیں جوابدہی کرنی ہے اسی ترتیب سے ہمیں اصلاح کا کام بھی کرنا ہے۔ سب سے پہلے اپنے اہل وعیال کو نارِ جہنم سے بچانا ہے۔ ہم بچوں کے معاملے میں زیادہ سخت ہو جاتے ہیں یا بہت ہی نرم چارہ۔ اعتدال اور توازن کا راستہ اختیار کرنا چاہیے، بے دین لوگوں کی ہزاروں کوتاہیاں نظر انداز کر دی جاتی ہیں، آنکھوں کے شہتیر بھی..... مگر دین دار لوگوں کی آنکھ کا تنکا بھی معاف نہیں کیا جاتا۔

پہلے چچا ماموں، خالہ پھوپھی سب کے مشوروں سے اولاد پالی جاتی تھی، مگر اب تو کسی کی مجال نہیں کہ بات کر سکے، کیونکہ تعلقات کی وہ نوعیت نہیں رہی۔ سب سے پہلے ان رشتوں سے جان چھڑائی جاتی ہے۔ کبھی دین کے پردے میں اور کبھی کسی اور بہانے سے۔ علیحدہ گھروں کے تصور نے مل جل کر رہنے کے سسٹم کو ختم کر دیا ہے۔ جب مل جل کر رہتے تھے تو بچوں پر کئی بڑوں کی نظریں ہوتی تھیں۔ اب صرف ماں باپ ہیں اور وہ کتنا اور کہاں تک دھیان رکھ سکتے ہیں۔ باپ روپیہ کمانے کی مشین بن گئے ہیں اور مائیں درس و تدریس اور دوروں پر لگی رہتی ہیں۔ یہ دین دار گھرانوں کا المیہ ہے۔

باتیں تو بہت ساری ہیں۔ اس وقت اپنی سمجھ کے مطابق چند اہم ایشوز کی طرف توجہ دلانی مقصود تھی۔ اب بات یہ ہے کہ جن گھروں میں یہ مسائل نہیں ہیں اور وہاں آئیڈیل قسم کے حالات ہیں تو اُن کو ضرور آگے بڑھنا چاہیے اور بتانا چاہیے کہ انہوں نے اپنے گھروں کے حالات کیسے سدھارے۔ نیک اولادیں کس طرح پروان چڑھائیں۔ سسرال اور میکے والوں سے اچھے تعلقات کس طرح بنائے اور قائم رکھے اور کس طرح سب کو خوش اور مطمئن رکھا اور اگر کبھی زندگی میں کوئی کرائسس آیا تو اس سے کس طرح نمٹے۔ شادی بیاہ، موت اور زندگی کے معاملات میں معاشرے سے ہٹ کر چلنے کے لیے کیا طریقے اختیار کیے۔ کیا جنگ لڑنی پڑی اور فتح کس طرح حاصل کی۔ (بشکریہ: پندرہ روزہ نشور، راولپنڈی)

بانیٔ تنظیم محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہٗ کے تنظیم اسلامی حلقہ گوجرانوالہ میں ہونے والے پروگرام کا شیڈول

1۔ 8 ستمبر (بروز ہفتہ) گیارہ بجے، خطاب: بار کونسل گوجرانوالہ

2۔ 8 ستمبر (بروز ہفتہ) بعد نماز مغرب، خطاب: وزیر آباد شہر

موضوع: پاکستان میں نظام خلافت کیا؟ کیوں؟ کیسے؟

3۔ 9 ستمبر (بروز اتوار) خطاب عام

بمقام: مسجد نمبرہ مرکز تنظیم اسلامی (محلہ ملک پارک) گوجرانوالہ

موضوع: پاکستان میں نظام خلافت کے قیام کا طریق کار

زیر اہتمام: تنظیم اسلامی گوجرانوالہ

برائے رابطہ: 0300-7446250 055-3015519

”کج سانوں مرن دا شوق وی اے“

نذیر ناجی

نذیر ناجی صاحب ایک منجھے ہوئے اور سینئر صحافی ہیں۔ اگرچہ اُن کا تعلق صحافیوں کے اُس قبیلہ سے ہے، جنہیں عرف عام میں سیکولر کہا جاتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اُن کا ویژن خاصا وسیع ہے، خصوصاً عالمی حالات کے حوالہ سے اُن کی تحریریں بالعموم بڑی فکر انگیز ہوتی ہیں۔ جو عام آدمی کے لئے انکشاف کی حیثیت رکھتی ہیں۔ زیرِ نظر مضمون کے تمام مندرجات سے اگرچہ ہمیں اتفاق نہیں ہے تاہم اُنہوں نے موجودہ حالات کا موازنہ جس طرح 71ء کے تشویشناک حالات سے کیا ہے وہ بہت حد تک حقیقت پر مبنی محسوس ہوتا ہے۔ قارئین ندائے خلافت کے استفادے کے لئے تینوں اقساط کو یکجا کر کے ذیل میں شائع کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

(1)

تڑختے اور کھولتے ہوئے دن شروع ہو چکے ہیں۔

ایسے دن 1970ء کے انتخاب کے بعد آئے تھے۔ شیخ مجیب الرحمٰن پاکستان کو حقیقی وفاق بنانا چاہتے تھے جبکہ اسٹیبلشمنٹ کا غالب حصہ انہیں حکومت دینے کو تیار نہیں تھا۔ وہ تمام سیاسی گروہ جو اس وقت مجیب الرحمٰن کو اقتدار دینے کے خلاف تھے، آج پرویز مشرف کے خلاف ہیں۔ صرف ایئر مارشل اصغر خان انتقال اقتدار کے حق میں تھے۔ آج وہ سیاسی طور پر متحرک نہیں۔ نواز شریف 1990ء کے بعد نمایاں ہونے والی سیاسی قوت کے رہنما ہیں۔ آج وہ بھی انہی لوگوں کے ساتھ کھڑے ہیں جو 1970ء میں جنرل یحییٰ کے ساتھ کھڑے تھے۔ بھارت یہ سب کچھ بظاہر خاموشی سے دیکھ رہا تھا لیکن اندر ہی اندر وہ پر امن انتقال اقتدار کو مشکل سے مشکل تر بناتا گیا۔ جیسے جیسے یحییٰ خان ٹولے نے انتقال اقتدار میں تاخیر کی، بھارت عوامی لیگ کو اپنے ایجنٹوں کے ذریعے انتہائی پوزیشن اختیار کرنے کی طرف راغب کرتا رہا۔ پاکستان کا جو سیاسی بحران پر امن طریقے سے حل ہو سکتا تھا، یحییٰ خان کی حمایت کرنے والے سیاسی عناصر اور بھارت کی سازشوں کے باعث تصادم میں بدل گیا اور ہمارا ملک دو ٹکڑے ہو گیا۔ وہ لوگ جو ملک توڑنے کے المیے کے ذمہ دار تھے، آج ڈھٹائی کے ساتھ اپنے منفی کردار سے مکرتے ہیں اور آج پھر پاکستان کے خیر خواہ بن کر ملکی بحران کا پر امن حل مشکل بنانے میں لگے ہیں۔ اس وقت دو منظر ہمارے سامنے تھے۔ ایک عوامی لیگ کی سربراہی میں منتخب حکومت کا قیام، جس کا بد سے بدتر نتیجہ یہ ہوتا کہ پاکستان نیم خود مختار ریاستوں پر مشتمل ایک کنفیڈریشن بن جاتا، جو بھارت کے ہاتھوں شکست اور ملک دو ٹکڑے ہونے سے بدرجہا بہتر تھا۔

ہم پھر اس طرح کے تڑختے اور کھولتے دنوں میں داخل ہو گئے ہیں۔ ایک طرف بحران کا پر امن حل ہے اور دوسری طرف ایسی تباہی و بربادی کا منظر ہے، جس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی کیونکہ ماضی میں کبھی کسی ایٹمی ملک کے اثاثے تباہ کرنے کے لئے عالمی طاقتوں نے جنگی کارروائی نہیں کی۔ پہلے میں پر امن حل کے امکانات پر بات کروں گا۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ امریکہ افغانستان میں امن کی خاطر ڈیورنڈ لائن کو مستقل سرحد کے طور پر تسلیم کرنے اور افغان حکومت کو اس پر رضامند کرنے کے لئے تیار ہے۔ اس پر اقوام متحدہ کی مہر تصدیق بھی ثبت ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں حکومت پاکستان کو امریکی تجویزیں پیش کی جا چکی ہے۔ امریکہ افغانستان میں پاکستان کے مفادات کو تحفظ دینے اور بھارتی اثر و رسوخ میں کمی پر بھی آمادہ ہے۔ افغانستان میں طالبان کو شریک اقتدار کرنے کے فارمولے بھی بنائے گئے ہیں اور اگر پاکستان تعاون پر آمادہ ہو جائے تو ایسے حتمی فارمولے تک پہنچنے کے امکانات انتہائی روشن ہیں، جو طالبان کے لئے بھی قابل قبول ہو۔ طالبان کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو ہر جنگ کسی نتیجے تک پہنچنے کے لئے ہوتی ہے۔ جنگ خود منزل مقصود نہیں ہوتی۔ یہ منزل کے حصول کا ذریعہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ طالبان پورے افغانستان پر قبضہ کر کے مستحکم حکومت قائم کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ جب انہیں پاکستان کی باقاعدہ فوجی امداد حاصل تھی۔ عالمی طاقتیں خاموش تھیں۔ سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات ان کے مددگار تھے۔ وہ اس وقت بھی پورے افغانستان پر اپنی حکومت قائم نہیں کر سکے تھے۔ اب صورتحال مختلف ہے۔ امریکہ اور نیٹو کی افواج براہِ راست وہاں جنگ میں شریک ہیں۔ طالبان کی مخالف قوتیں پہلے سے زیادہ طاقتور ہو چکی ہیں اور دہشت گردی کے الزام نے طالبان کو عالمی ہی نہیں، اسلامی برادری کی حمایت سے محروم کر دیا ہے۔ پاکستان بھی انہیں کھل کر مدد دینے کے قابل نہیں رہ گیا۔ ان کی جنگ ہماری سلامتی کے لئے خطرات کا باعث بن رہی ہے۔ اگر وہ حالات کا صحیح ادراک کریں تو مناسب یہی لگتا ہے کہ پاک امریکہ تعلقات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم افغانستان میں شرکت اقتدار کے لئے بہتر سے بہتر شرائط حاصل کرنے کی کوشش کریں اور خطے میں امن قائم کرنے کے عمل میں شریک ہو جائیں۔ اس میں پاکستان کا بھی بھلا ہے اور خود طالبان اور پختون بھائیوں کے لئے بھی اچھائی ہے۔ ہمارے لئے ایک اور ترغیب یہ موجود ہے کہ افغانستان میں امن سمجھوتے کے لئے امریکہ کشمیر کے معاملے میں بھارت پر دباؤ ڈالنے کے لئے آمادہ ہے۔ صدر مشرف نے اس تنازع کے حل کے لئے جو فارمولے پیش کئے ہیں، ان سے ملتا جلتا کوئی حل امریکی دباؤ کے نتیجے میں ممکن دکھائی دے رہا ہے۔ اگر ہمیں ملک کا مفاد عزیز ہے تو ان امکانات سے فائدہ اٹھانے کے لئے مل جل کر کوششیں کرنا چاہئیں مگر مجھے نظر نہیں آتا کہ ہم سلامتی اور امن کا راستہ اختیار کرنے پر آمادہ ہیں۔ ہم شاید اس پر توجہ ہی نہیں دے رہے یا اسے قابل توجہ نہیں سمجھتے۔ ہم اسی طرح تباہی کے راستے پر بگٹٹ دوڑے چلے جا رہے ہیں، جیسے 1971ء کے انتخابی نتائج کے بعد سقوط مشرقی پاکستان تک دوڑتے ہی چلے گئے تھے۔

اسلام آباد کی اسٹیبلشمنٹ کے اشارے پر جس طرح طالع آزما سیاست دانوں نے ملک و قوم کو تباہی سے دوچار کیا، وہ ہماری تاریخ کا المناک واقعہ ہے۔ ہم اقتدار کی جنگ میں اس قدر اندھے ہو گئے تھے کہ ہمیں بھارت کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کی کوئی فکر نہیں تھی۔ عوامی لیگ کے روپوش لیڈر بھارت میں پناہ گزین ہو چکے تھے۔ وہاں پناہ گزینوں کے کیمپ تیار کئے جانے لگے تھے۔ اس کے باوجود ہم نے مشرقی پاکستان پر فوج کشی کر دی۔ منصوبے کے عین مطابق لاکھوں بنگالی سرحد پار کر کے بھارت چلے گئے اور ان مہاجرین کے نام پر پاکستان کے خلاف جو مہم چلائی گئی۔ اس نے عالمی برادری میں ہمیں رسوا کر دیا، کوئی ہمارا ہمدرد نہ رہا، کوئی ہمارا ساتھ نہ دے سکا، حتیٰ کہ برادر مسلم ممالک بھی اظہار ہمدردی سے قاصر ہو گئے۔ شکست ہمارا مقدر بنی۔ ملک دولخت ہو گیا۔ اسٹیبلشمنٹ شاید یہی چاہتی تھی کیونکہ شکست کے ذمہ دار جرنیلوں اور ان کے ساتھیوں کو

بڑی محبت سے گھروں کو بھیج دیا گیا اور یحییٰ خان کو عزت و احترام کے ساتھ سرکاری مہمان خانے میں محفوظ کر دیا گیا تاکہ وہ عوام کے غیظ و غضب سے بچا رہے۔ یہ انداز ظاہر کر رہے تھے کہ اسٹیبلشمنٹ کو ملک ٹوٹنے کا کوئی دکھ نہیں۔ باقی ماندہ پاکستان میں اقتدار کا کھیل بے حیائی سے جاری رکھنے کی کوشش کی گئی۔ یحییٰ خان شکست کے بعد بھی اپنا اقتدار باقی رکھنے پر بضد تھا۔ اگر فوج کے جونیئر آفیسرز حرکت میں نہ آتے تو وہ اپنا فوجی اقتدار قائم رکھنا چاہتا تھا۔ کس قدر اندھا اور بے شرم کر دیتا ہے اقتدار کا لالچ؟ میں نے 1970ء کے انتخابات کے بعد آنے والے امتحانی دنوں کو کیوں یاد کیا؟ آج مجھے یوں لگتا ہے کہ ہم اس طرح کے تڑختے اور کھولتے دنوں سے گزر رہے ہیں۔ ہم پھر اقتدار کی جنگ میں دست و گریباں ہیں۔ ہم نے اپنی تمام جدوجہد کا ہدف ایک شخص کو بنا کر یہ سمجھ لیا ہے کہ اس طرح اقتدار کی جنگ جیتی جا سکتی ہے۔ ہمارے اردگرد کیا ہو رہا ہے؟ کیا سازشیں پروان چڑھ رہی ہیں؟ کیا منصوبے تیار ہو رہے ہیں؟ اس کی ہمیں پروا نہیں۔ آخر وہ کون سے طوفان ہیں، جو ہماری ذرا سی کوتاہی کے نتیجے میں ہم پر یلغار کر سکتے ہیں۔

(2)

آیئے، بھارت کی طرف دیکھتے ہیں۔ ہمیں ایک طرف اپنے شمالی علاقوں پر عالمی طاقتوں کی طرف سے حملوں کی دھمکیوں کا سامنا ہے۔ دوسری طرف دہشت گردی دارالحکومت کے قلب تک پہنچ چکی ہے۔ وزیرستان کا بیشتر حصہ ریاست کے کنٹرول سے نکل چکا ہے اور وہاں باغیوں نے ریاستی ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں۔ صوبہ سرحد کے اضلاع میں پاکستانی شہری دہشت گردوں کے حملوں کی لپیٹ میں ہیں۔ بلوچستان میں امن و امان کی صورتحال کنٹرول سے باہر آتی جا رہی ہے۔ چترال اور سوات میں باغی تنظیمیں زور پکڑ رہی ہیں اور سیاسی جماعتیں اقتدار کی جنگ میں اس بری طرح سے دست و گریباں ہیں، جیسے 1971ء میں تھیں۔ اس وقت بھی فوج اور پاکستانی شہریوں میں تصادم ہو رہا تھا۔ دونوں طرف سے پاکستانیوں کا خون بہہ رہا تھا۔ بھارت حملے کی تیاریاں کر رہا تھا اور ہماری سیاسی جماعتیں عوامی لیگ کے منتخب نمائندوں کی ناجائز طور سے چھینی گئی سیٹوں پر یحییٰ خان سے ریوڑیاں مانگ رہی تھیں یعنی نامزدگیاں لے کر اسمبلیوں میں بیٹھنے کے لئے بے تاب تھیں۔ انہیں اسمبلیوں میں بٹھا کر وزارتیں بھی دے دی گئیں۔ وہ اس کے مزے لوٹتے رہے اور انہیں کوئی خبر نہ تھی کہ پاکستان ٹوٹ رہا ہے۔ قاضی حسین احمد صاحب سے پوچھا جا سکتا ہے کہ یہ ریوڑیاں اور وزارتیں لینے والے کون تھے؟

اقتدار کی اندھی جنگ میں جنونیوں کی طرح ایک دوسرے کے پر نوچنے میں مصروف سیاستدانوں کو فرصت ملے تو امکانی خطرات کی طرف دیکھ لیں۔ طالبان اور دہشت گردوں سے ہماری لاتعلقی کے دعوے اب دنیا میں کوئی تسلیم نہیں کر رہا۔ اس بات کو یقینی سمجھا جا رہا ہے کہ افغانستان میں جنگی کارروائیاں کرنے والے طالبان کو پاکستان سے مدد ملتی ہے۔ وہ یہاں سے افرادی قوت اور اسلحہ لیتے ہیں۔ انہیں تربیتی کیمپ دستیاب ہیں۔ انہیں ماہرانہ جنگی رہنمائی میسر ہے۔ القاعدہ جو عالمی دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث ہے، اس کے غیر ملکی کارکن بھی پاکستان کے شمالی علاقوں میں موجود ہیں۔ القاعدہ کے کئی مراکز ان علاقوں میں دنیا بھر کے اندر دہشت گردوں کو تربیت دیتے ہیں۔ یہ لوگ چیچنیا، ازبکستان، چین، سعودی عرب، مصر، یورپ، بھارت اور دنیا کے کئی ملکوں سے آئے ہوئے ہیں۔ امریکی اور برطانوی حکومتوں نے پاکستان کے سامنے وہ دستاویزات اور تصاویر پیش کی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ القاعدہ کے مراکز میں امریکہ اور یورپ کے ایٹمی اڈوں کو دہشت گردی کا نشانہ بنانے کی تیاری کی جا رہی ہے۔ حکومت پاکستان کو انتباہ کیا گیا ہے کہ اگر اس طرح کی دہشت گردی کا واقعہ ہوا تو پھر پاکستان کو ناقابل تصور نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ بات صدر پرویز مشرف کے حوالے سے گزشتہ روز لکھ بھی چکا ہوں۔

اس واضح دھمکی کی روشنی میں ہمیں بھارتی مقاصد و مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے اندازہ لگانا چاہئے کہ وہ کیا کر رہا ہوگا؟ اگر پاکستان اسی راستے پر آگے بڑھتا ہے، جس پر ہم اس وقت چل رہے ہیں اور امریکہ اور پاکستان کے درمیان بداعتمادی کشیدگی میں بدلتی ہے اور اس کشیدگی کے دوران دہشت گردی کا کوئی بڑا واقعہ امریکہ یا اس کے کسی اتحادی ملک میں رونما ہو جاتا ہے تو کیا امریکہ اپنی دھمکی پر عمل درآمد نہیں کرے گا؟ بھارت کے لئے یہ ایک سہانے خواب کی تعبیر ہوگی کہ امریکہ یورپ کے ساتھ مل کر پاکستان پر حملہ کرے اور اس کے وارے نیارے ہو جائیں۔ بھارت اپنے سہانے خواب کو پورا کرنے کے لئے یقیناً تیاریاں کر رہا ہوگا۔ اس نے امن کے عمل کو منجمد کر دیا ہے۔ کشمیر میں ہونے والی پیش رفت روک دی گئی ہے۔ یہ سب کچھ کس چیز کے انتظار کی علامت ہے۔ افغانستان میں بھارتی اثر و رسوخ نہ صرف جنوبی افغانستان میں پھیل چکا ہے بلکہ پاکستان کے قبائلی علاقوں حتیٰ کہ طالبان میں بھی کسی نہ کسی سطح پر اس کے رابطے قائم ہو چکے ہیں۔ بھارت نے پاکستانی سرحدوں کے ساتھ افغانستان میں جگہ جگہ قونصل خانے کھول دیئے ہیں۔ ایک خبر کے مطابق افغانستان میں بھارتی قونصل خانوں کی تعداد امریکہ سے زیادہ ہو چکی ہے۔ امریکہ میں بھارتی شہری لاکھوں کی تعداد میں رہتے ہیں جبکہ افغانستان میں ان کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ وہاں امریکہ سے زیادہ قونصل خانوں کی ضرورت کیوں پڑی؟ یہ جاننے کے لئے گہرے غور و فکر کی ضرورت نہیں۔ بھارت افغانستان میں بلوچ باغیوں کو تربیت اور وسائل مہیا کر رہا ہے اور ان کے ذریعے مزید بلوچوں کو افغانستان میں اکٹھا کیا جا رہا ہے۔ کرزئی انتظامیہ بھارت کے زیر اثر ہے۔ حکومت میں شامل شمالی اتحاد بھارت کا باقاعدہ ایجنٹ ہے اور اس کے لیڈر پاکستان کے کھلے دشمن ہیں۔ بھارت کی کوشش یہ ہے کہ پاکستان کی طرف سے طالبان کی مداخلت افغانستان کے اندر جاری رہے اور امریکہ میں بطور اتحادی پاکستان سے مایوسی بڑھتی جائے۔ امریکی ڈیموکریٹس روایتی طور پر بھارت کے حامی ہیں۔ اس جماعت کی انتخابی مہم میں پاکستان کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا جا رہا ہے، ان سے مستقبل کے امکانات کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ میں امریکہ کے صدارتی امیدواروں کی طرف سے پاکستان کے بارے میں جو پڑھتا ہوں، اس میں بھارتی کوششوں کا دخل واضح نظر آتا ہے۔ افغانستان میں اپنی سرگرمیوں کا جواز بھارتی میڈیا کی طرف سے یہ پیش کیا جاتا ہے کہ ہم برصغیر میں مستقل امن قائم کرنے کے لئے پاکستان کے ساتھ ''گریٹ ڈیل'' کرنا چاہتے ہیں۔ جب ہم افغانستان میں فیصلہ کن اثر و رسوخ حاصل کر لیں گے تو اس وقت پاکستان کو پیشکش کریں گے کہ وہ افغانستان پر اپنی بالادستی کے بدلے میں کشمیر سے دستبردار ہو جائے۔ اس طرح پاکستان کو مطلوبہ ڈیپتھ یا گہرائی دستیاب ہو جائے گی۔ ہمیں کشمیر مل جائے گا اور برصغیر امن کا گہوارہ بن جائے گا۔ یہ خیال یقیناً امریکیوں کو لبھانے والا ہے اور شاید اسی لئے امریکی افغانستان کے اندر بھارتی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی یا ان سے چشم پوشی کر رہے ہیں۔

لیکن میں بھارتی عزائم کو دوسری طرح دیکھ رہا ہوں مجھے راہول گاندھی کا وہ بیان نہیں بھولا، جس میں اس نے کہا تھا کہ ہمارے خاندان کو پاکستان توڑنے کا اعزاز حاصل ہے۔ آج وہی خاندان پھر بھارت پر حکمران ہے اور یقیناً یہ اعزاز دوبارہ حاصل کرنا اس کی تمنا ہوگی۔ بھارت اور اسرائیل کا باہمی تعاون کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اگر یہ دونوں ملک مل کر فیصلہ کر لیں کہ یورپ اور امریکہ کے اندر کسی ایٹمی ٹھکانے کو دہشت گردی کا ہدف بنانا ہے تو وہ آسانی سے ایسا کر سکتے ہیں۔ پاکستان کے ایٹمی اثاثے اسرائیل اور بھارت دونوں کو کھٹکتے ہیں۔ اس طرح کی ایک واردات سے ان دونوں کو اپنا مقصد پورا ہوتا نظر آیا تو وہ کبھی اس سے گریز نہیں کریں گے۔ وہ اس لمحے کے انتظار میں ہیں، جب امریکہ اور پاکستان میں کشیدگی اس درجے پر پہنچ جائے، جب دہشت گردی کا ایک چھوٹا سا واقعہ بھی امریکہ کے پیمانہ صبر کو چھلکا دے اور وہ پاکستان پر حملہ آور ہو جائے۔ اسرائیل امریکہ کو فریب دے کر اس سے عراق میں فوج کشی کرا چکا ہے جبکہ عراق میں نہ ایٹمی صلاحیت تھی اور نہ دہشت گردی۔

پاکستان میں یہ دونوں ہیں۔ دہشت گردی کا ایک واقعہ امریکیوں کو پاگل کر سکتا ہے۔ اسرائیل اور بھارت اس صورتحال سے فائدہ اٹھانے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے مگر مجھے لگتا ہے کہ ہم دہشت گردی کی واردات کے بغیر ہی ان کا راستہ آسان کر دیں گے۔

3

بھارتی اس انتظار میں ہیں کہ پاکستانی خود ہی 1971ء کی طرح ایسے حالات پیدا کر دیں کہ نیٹو اور امریکہ کی فوجی کارروائی نہ صرف ناگزیر بلکہ عالمی رائے عامہ کے لیے بھی قابل قبول ہو جائے۔ شمالی علاقوں میں طالبان اور القاعدہ کی کارروائی روکنے کے لیے امریکی دباؤ میں اضافہ ہوتا جائے۔ پاکستان کی سیکیورٹی فورسز قبائلیوں اور غیر ملکی جنگجوؤں کے ساتھ جھڑپوں میں پھنستی چلی جائیں۔ بلوچستان میں خانہ جنگی بڑھتی جائے۔ پنجاب اور سندھ میں انتہا پسندوں کی سرگرمیاں پھیلتی رہیں اور عالمی رائے عامہ میں یہ تاثر پختہ ہوتا چلا جائے کہ پاکستان دہشت گردی اور انتہا پسندی کا مرکز ہے اور یہاں سے تمام عالمی طاقتوں کو خطرہ ہے۔ پاکستان کے ایٹمی اثاثوں پر دہشت گردوں کا قبضہ ہونے کا خطرہ بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ مذہبی جماعتیں اور تنظیمیں جو دہشت گردوں کی انتہا پسندانہ پالیسیوں کی حامی ہیں اقتدار کی طرف پیش قدمی کر رہی ہیں۔ پاکستانی میڈیا میں انتہا پسندوں کی حمایت اس تاثر کو آگے بڑھا رہی ہے۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ایک طبقہ اس خیال کا حامی ہے کہ امریکی دباؤ کے باوجود طالبان کی سرپرستی جاری رکھی جائے۔ اسٹیبلشمنٹ کے اس حصے کی سوچ یہ ہے کہ امریکہ اور نیٹو افغانستان میں شکست کھا رہے ہیں۔ انہیں ایک نہ ایک دن وہاں سے بھاگنا پڑے گا' اگر ہم نے طالبان سے لڑائی مول لے لی اور وہ بیرونی افواج کے انخلاء کے بعد افغانستان میں حکمران بن گئے تو ہمیں ایک دشمن ہمسائے کا سامنا ہوگا۔ اس کے برعکس اگر ہم بیرونی افواج کے انخلاء کا انتظار کریں اور طالبان کی مدد جاری رکھیں تو افغانستان آخر کار ان کے تسلط میں آئے گا اور اس طرح ہمیں سٹریٹیجک گہرائی میسر آ جائے گی۔ کابل میں ایک ایسی حکومت قائم ہو جائے گی جو ہمارے زیر اثر ہو گی۔ یہ سوچ یقیناً قوم پرستی پر مبنی ہے مگر اس پر جذباتیت غالب ہے۔ جیسے مشرقی پاکستان میں تصور کر لیا گیا تھا کہ ہم اپنے بحران پر فوجی طاقت سے قابو پا لیں گے اور کسی بیرونی طاقت کو مداخلت کی جرأت نہیں ہوگی۔ اسی طرح مقتدر قوتوں کا ایک بڑا حصہ اور اس کے سیاسی حواری بھی خام خیالی میں مبتلا ہیں۔ ان کی رائے ہے کہ ہمیں امریکہ کو صاف جواب دیتے ہوئے یہ کہہ دینا چاہیے کہ ہم افغانستان پر اس کے قبضے کے خلاف ہیں اگر وہ افغانستان میں امن چاہتا ہے تو وہاں سے بوریا بستر باندھ کر نکل جائے' ورنہ ہم افغان تحریک آزادی کی حمایت جاری رکھیں گے۔ اسی سوچ کے تحت ان قوتوں کی انتخابی مہم منظم کی جا رہی ہے اور اس طرح آئندہ انتخابات میں دو قوتیں آمنے سامنے ہوتی دکھائی دے رہی ہیں۔

موجودہ گروپوں اور صف بندیوں کو عارضی جانیے انتخابات تک پہنچنے سے پہلے بہت کچھ ہونے کا امکان ہے۔ صدر پرویز مشرف اب صرف ایک علامت رہ گئے ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ بحران کے پرامن حل کی حامی قوتیں پرویز مشرف کی کمزور پڑتی قیادت پر اپنا انحصار جاری رکھیں گی۔ انہیں پرویز مشرف کے مخالفین کی بڑھتی ہوئی قوت کا اندازہ ہے، وہ دیکھ رہے ہیں کہ ان کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے اور وہ اپنے ہی اقدامات کے ذریعے مشکلات میں اضافہ کرتے جا رہے ہیں۔ وہ مقاصد جو پرویز مشرف کے ذریعے پورے کیے جا سکتے ہیں وہ ان کی سیاسی پوزیشن سے متاثر ہو رہے ہیں۔ کشمکش اقتدار اور برتری کی خواہش مند طاقتوں کے تصادم میں ہم خیالی اور جذباتی رشتوں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ اندرون ملک وہ طاقتیں بری طرح برسرپیکار ہیں۔ ایک طاقت وہ ہے جو انتہا پسندی کا راستہ اختیار کر کے امریکہ اور اس کے اتحادیوں سے محاذ آرائی کرنے کی خواہش مند ہے، وہ کھل کر کہتے ہیں کہ ہم امریکی دباؤ کو مسترد کریں گے' طالبان کی حمایت جاری رکھیں گے' انتہا پسندی ہمارا داخلی معاملہ ہے' دہشت گرد امریکی پالیسیوں کے ردعمل کی پیداوار ہیں، لہٰذا امریکہ اپنی عالمی پالیسیوں میں تبدیلی لائے۔ دہشت گرد صرف اسی صورت میں غیر مؤثر ہو سکتے ہیں، کشمیر میں پرامن حل کی امیدیں چھوڑ کر وہاں جہاد جاری رکھنا چاہیے' بھارت کے ساتھ امن کا تصور خیال خام ہے۔ وہ ہمارا ازلی دشمن ہے اور اس کے ساتھ ہماری دشمنی ہمیشہ برقرار رہے گی۔ اس مکتبہ فکر کے لوگ بھارت کے ساتھ ایٹمی جنگ کو بھی خارج از امکان قرار نہیں دیتے۔ انہیں مذہبی اور قوم پرستانہ جذبات تقویت دیتے ہیں۔ پاکستان کے سادہ لوح عوام اسلام اور حب الوطنی کے نعروں سے دیوانہ وار متاثر ہوتے ہیں جس ملک کے نوجوان خودکشی پر آمادہ ہوں' انہیں کسی بھی طرح کی مہم جوئی کے لیے تیار کرنا مشکل نہیں۔ یہ سوچ رکھنے والے لوگوں کا خیال ہے کہ ہماری ایٹمی طاقت اور عوامی جذبات کے یہ اثاثے ہمیں تمام عالمی طاقتوں سے ٹکرا جانے کی اہلیت دیتے ہیں۔ ہم اس اہلیت کو استعمال کر کے امریکہ کو پسپائی پر مجبور کر سکتے ہیں اور بھارت کے ہوش ٹھکانے لگا سکتے ہیں۔ پرویز مشرف اس طاقت کے استعمال سے گریز کر کے ملکی مفادات سے روگردانی کر رہے ہیں۔ وہ بے نظیر بھٹو کی سیاسی مدد لے کر بحران کا پرامن حل ڈھونڈنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے وہ پاکستان کے مفادات قربان کریں گے اور وہ ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ یہ ایک واضح تقسیم ہے جو اسٹیبلشمنٹ سے لے کر سیاست تک فکری اعتبار سے ہو چکی ہے۔ اس کے عملی اظہار کی ابتدائی علامتیں ظاہر ہونے لگی ہیں۔ انتہا پسند الیکشن سے پہلے غلبہ چاہتے ہیں۔ انہیں اپنے حامیوں کی طاقت پر بھروسہ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ انتخابات کے جھمیلے میں پڑنے سے پہلے ہی اقتدار پر قبضہ کر لیا جائے۔ وہ سیاسی اور سماجی محاذ پر پرویز مشرف کو منظر سے ہٹا کر اپنی فتح کا اعلان کرنا چاہتے ہیں تاکہ بحران کے پرامن حل کی حامی قوتیں سراسیمہ ہو کر دبک جائیں اور وہ انتخابات میں یک طرفہ کامیابی کی فضا بن جائے۔ دوسری طرف بھی یہی صورت حال ہے' انتہا پسندوں کی مخالف قوتیں بھی اسی خیال میں ہیں کہ اگر پرویز مشرف کی پسپائی لازم ہو گئی تو پھر اس کے وقوع سے پہلے خود پیش عملی کر لی جائے اور انتہا پسند طاقتوں کو پیچھے دھکیل کر اپنے ایجنڈے پر عمل درآمد کا راستہ ہموار کیا جائے۔

ان دو طاقتوں کے تصادم اور ایک دوسرے پر غالب آنے کی بے رحم کشمکش میں بھارتی حکمرانوں کو اپنے مقاصد کے لیے راہیں نکلتی نظر آ رہی ہیں' وہ اس انتظار میں ہیں کہ تصادم شدت پکڑے' پاکستانی خود ایک دوسرے سے دست و گریبان ہوں، انتہا پسند اپنی مسلح شاخوں کو میدان عمل میں لائیں اور حکومت پر قابض پرامن حل کی حامی قوتیں ریاستی طاقت کا استعمال کریں۔ گلیوں میں مسلح جھڑپیں ہوں' بدامنی چاروں طرف پھیلے' بلوچستان میں باغیوں کی سرگرمیاں تیز ہوں' شمالی علاقوں کے طالبان صوبہ سرحد اور اسلام آباد تک یلغار کریں اور اس طرح پاکستانی ریاست داخلی تباہی کے عمل میں مبتلا ہو جائے اور کسی جنگ کا سامنا کیے بغیر اس کے مقاصد پورے ہو جائیں۔ ہمارے ملک کو اس صورت حال سے دوچار ہوتے دیکھ کر عالمی طاقتیں یقینی طور پر ہمارے ایٹمی اثاثوں کو ختم کرنے کی کوشش کریں گی جس کا وہ اعلان کر چکی ہیں بلکہ یہاں تک بتایا جا چکا ہے کہ امریکیوں کو پورا علم ہے کہ پاکستان کے ایٹمی اثاثے کہاں کہاں محفوظ کیے گئے ہیں؟ یہ جوتر ختے اور کھولتے ہوئے دن ہم پر گزر رہے ہیں انہی دنوں کی طرح ہمیں ایسے موڑ کی طرف لا رہے ہیں جس سے ایک راستہ امن اور سلامتی کی طرف جاتا ہے اور دوسرا تباہی و بربادی کی طرف۔ دسمبر 1971ء میں ایسے ہی موڑ پر پہنچ کر ہم نے تباہی کا راستہ چنا تھا۔ اب پھر اسی طرح کے موڑ پر آ کھڑے ہیں اگر پھر وہی راستہ چنا جو 1971ء میں چنا تھا تو منیر نیازی کے مصرعے کو قدرے بدل کے یوں پڑھنا پڑے گا۔

کج دنیا والے ظالم نیں
کج سانوں مرن دا شوق وی اے

(بشکریہ روزنامہ ''جنگ'')

امیر حلقہ سرحد شمالی کا دورۂ چترال و دیر

تنظیم اسلامی کا حلقہ سرحد شمالی دُور افتادہ اور دُشوار گزار پہاڑی علاقوں پر مشتمل ہے جس میں ضلع چترال بھی شامل ہے۔ یہاں ڈاکٹر اکرام اللہ کی محنت سے کچھ احباب تنظیم میں شامل ہوئے ہیں۔ اِن کو باقاعدہ اُسرہ کی شکل دینے اور رفقاء کو مزید ترغیب وتشویق دلانے کی غرض سے امیر حلقہ نے راقم کے ساتھ وہاں کا دورہ کیا، جس کی تفصیل درجہ ذیل ہے۔

27 جولائی کو تنظیم اسلامی دیر کے رفقاء سے ملاقات ہوئی کیونکہ یہ چترال سے پہلے آتا ہے۔ انہیں تنظیمی اُمور کے ساتھ ساتھ حلقہ قرآنی کے تسلسل کو قائم رکھنے اور احباب کے ساتھ تعلق و رابطہ اُستوار کرنے کی تاکید کی گئی۔ رفقاء کے سوالات کے جوابات بھی دیئے گئے جو حالات حاضرہ سے متعلق تھے اور اُن کو پانچ باتوں پر عمل کرنے کا کہا گیا:

1۔ ذاتی احتسابی رپورٹ روزانہ کے بنیاد پر پُر کرنا
2۔ اجتماعات میں حاضری
3۔ لٹریچر کا مطالعہ بالخصوص اپنے نصاب کو پیش نظر رکھنا
4۔ جرائد ندائے خلافت اور میثاق کو باقاعدہ پڑھنا
5۔ انفاق فی سبیل اللہ کی باقاعدہ اور خوشی سے ادائیگی

دیر میں رات گزار کر اگلی صبح 28 جولائی کو ساڑھے نو بجے ہم چترال کے لئے روانہ ہوئے اور چھ گھنٹے کے سفر کے بعد ساڑھے تین بجے چترال پہنچے، جہاں ڈاکٹر اکرام اللہ ہمارے منتظر تھے۔

شیڈول کے مطابق 29 جولائی بروز اتوار صبح نو بجے پہلی نشست ہوئی، جس میں 10 رفقاء اور دو احباب نے شرکت کی۔ پروگرام کا آغاز رفیق تنظیم جناب ریاض الرحمان کی تلاوت سے ہوا جو مقامی جامع مسجد میں امام بھی ہیں۔ تلاوت کے بعد امیر حلقہ نے فرائض دینی کے جامع تصور کا خلاصہ پیش کیا اور فرمایا کہ اقامت دین کے لئے نبویؐ طریقہ کار پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے اور اسی طریقہ کار کے تحت ہمیں منظم انداز میں کام کرنا چاہیے جس کے لئے ایک جماعت کی ضرورت ہے تب ہی یہ قربانی نتیجہ خیز ہوگی۔ اِسی مقصد کی خاطر تنظیم اسلامی قائم کی گئی ہے۔ تنظیم کی بنیاد بیعت مسنونہ پر ہے اور یہ ایک امیر کی اطاعت میں سرگرم عمل ہے۔ ہمیں جہاں تین رفقاء ایک مقام پر میسر آجائیں تو اُن کو ایک ساتھ جوڑ کر اُسرہ کی شکل دی جاتی ہے جس پر ایک نقیب ہوتا ہے جو اُن کی نگرانی اور تزکیہ کرتا ہے۔ لہٰذا آج سے آپ باقاعدہ اُسرہ کی شکل میں ہیں اور ڈاکٹر اکرام اللہ صاحب آپ کے نقیب ہیں۔

اُسرہ کی تشکیل کے بعد راقم نے تنظیم اسلامی کا انتظامی ڈھانچہ بورڈ کی مدد سے سمجھایا جس میں ایک طرف اطاعت کے نظام اور دوسری طرف شورائیت کے نظام کو واضح کیا گیا۔ اس کے بعد نظام العمل کے مطابق اُسرہ کے تربیتی و تنظیمی اجتماعات کی تفصیل بتائی، نیز حلقہ قرآنی کے ذریعے احباب تک پیغام قرآن کو پہنچانے کی ترغیب دی گئی۔ یہ نشست ساڑھے بارہ بجے تک جاری رہی، کیونکہ مقامی طور پر یہاں تمام مساجد میں ایک بجے ظہر کی جماعت ہوتی ہے۔

دوسری نشست کے لئے پانچ بجے کا وقت دیا گیا۔ مقررہ وقت پر رفقاء جمع ہوئے اور امیر حلقہ نے صبح کی نشست کا خلاصہ پیش کیا۔ آپ نے اُسرہ کو اجتماعات کے ذریعے فعال بنانے اور حلقہ قرآنی کے ذریعے احباب تک دین کا پیغام پہنچانے پر زور دیا۔ اور سالانہ اجتماع میں آنے، تربیت گاہ میں شمولیت اور فکر تنظیم کو پختہ کرنے کی طرف توجہ دلائی۔

یہ نشست بھی نماز مغرب تک جاری رہی۔ امیر حلقہ نے اپنا ذاتی کمپوٹر بھی اُسرہ کے حوالہ کیا تاکہ رفقاء بھرپور استفادہ کرسکیں۔ ڈاکٹر اکرام اللہ نے وہاں دفتر کھول کر تمام کتب و کیسٹس اُس میں رکھی ہیں جس سے رفقاء و احباب فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔

ڈاکٹر اکرام اللہ اور اُن کے والد پروفیسر کریم اللہ نے ہماری بہت مہمان نوازی کی۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں اجر عظیم عطا فرمائے اور ہم سب کو دین کی اقامت کے لئے ہمت و استقامت دے۔

(مرتب: احسان الودود)

تنظیم اسلامی نیو ملتان کا ماہانہ اجتماع و فہم دین پروگرام

فہم دین پروگرام

تنظیم اسلامی نیو ملتان، ملتان شہر کی سرگرم تنظیم ہے، جس میں سات اسرہ جات ہیں۔ تقریباً ہر اسرہ میں حلقۂ قرآنی قائم ہے اور اس وقت اس میں 54 رفقاء ہیں۔ اور اِس تنظیم کے زیر انتظام جامع مسجد الھدیٰ بھی ہے۔ تنظیم کے تمام بڑے اجتماعات، ماہانہ شب بیداری پروگرام اور فہم دین پروگرام یہیں پر ہوتے ہیں۔

15 جولائی 2007ء کو فہم دین پروگرام منعقد ہوا۔ جس میں نقبائے تنظیم اور 4 اسروں کے رفقاء نے شرکت کی۔ ناظم دعوت حلقہ جنوبی پنجاب محمد سلیم اختر نے فہم دین پروگرام میں احباب کے سامنے تنظیم کی فکر پیش کی اور فرائض دینی کے جامع تصور، دین و مذہب کے فرق اور منہج انقلاب نبوی ﷺ پر مختصر مگر جامع خطاب فرمایا۔ احباب سے سوالات کی نشست بھی ہوئی۔ یہ پروگرام بعد از نماز ظہر شروع ہوا اور ساڑھے چار بجے تک جاری رہا۔ پروگرام کے آخر میں 2 احباب نے تنظیم میں شمولیت اختیار کی۔

ماہانہ شب بیداری

21 جولائی 2007 کو مسجد الھدیٰ میں ماہانہ شب بیداری کا پروگرام ہوا۔ محمد سلیم اختر نے بعد نماز مغرب درس قرآن دیا۔ درس حدیث مولانا عزیز الرحمٰن ترابی نے دیا۔ پروگرام کے آخر میں بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا خطاب بعنوان ''لال مسجد آپریشن'' سماعت کیا گیا۔ بعد ازاں شرکاء کو کھانا پیش کیا گیا۔ 16 رفقاء نے رات مسجد میں قیام فرمایا۔ رفقاء کو صبح تین بجے نماز تہجد کے لئے جگایا گیا۔ انفرادی نوافل و تلاوت کے بعد انہیں گروپوں میں تقسیم کر کے مسنون دعائیں یاد کرائی گئیں۔ نماز فجر کے بعد مولانا عزیز الرحمٰن نے مختصر درس قرآن مجید دیا۔

ایک روزہ تربیتی پروگرام

22 جولائی صبح آٹھ بجے سے لے کر نماز ظہر تک ایک روزہ تربیتی پروگرام ہوا۔ جس میں آٹھ رفقاء نے مختلف عنوانات پر گفتگو کی۔ اس تربیتی نشست کا آغاز قاری حفیظ الرحمٰن کے درس قرآن مجید سے ہوا۔ پروگرام کے آخر میں سوال و جواب کی نشست بھی ہوئی۔ جس میں صبح کے اوقات میں بیان ہونے والے مختلف موضوعات سے متعلق سوال و جواب ہوئے۔ نماز ظہر کی ادائیگی کے بعد یہ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔ (مرتب: شوکت حسین انصاری)

ضرورت رشتہ

☆ پی ایچ ڈی میں زیر تعلیم بیٹی عمر تقریباً 35 سال کے لیے دیندار گھرانے سے رشتہ مطلوب ہے۔ ذات پات کی کوئی قید نہیں۔ برائے رابطہ: 0300-9462188

☆ لاہور کی رہائشی دو بہنوں کے لیے، جن کی عمریں 23 اور 24 سال، تعلیم بالترتیب بی فارمیسی اور ایم اے (انگریزی) ہے، دینی مزاج کے حامل تعلیم یافتہ، برسر روزگار لڑکوں کا رشتہ درکار ہے۔ برائے رابطہ: 0300-4529664 042-6845630

☆ کراچی کی رہائشی، لڑکی عمر 23 سال، تعلیم MA (پولیٹیکل سائنس) ایک سالہ فہم دین کورس، شریف گھرانے سے وابستہ اردو سپیکنگ پوسٹ گریجویٹ لڑکے کا رشتہ درکار ہے۔ برائے رابطہ: 0307-2390376

- Ex Army chief General Jahangir Karamat took kickbacks of more than US$ 20 Million from Ukrainian tank company for purchase of 300 Ukrainian tanks for Pakistan Army through a middleman named as Colonel Mahmood, a brother tank corps officer of Karamat. Former Prime Minister Nawaz Sharif sent the present chief of the WAPDA Major General Zulfiqar, then serving in ISI, to Ukraine and Azerbaijan to investigate the scam.

- General Zulfiqar compiled a complete report of the transaction and the bribes given. But the Army tried to buy him out by rewarding him with the post of WAPDA Chairman and promoting him to the rank of a three star General. The then Army Chief, General Jahangir Karamat was forced to resign, based on the threat that if he did not, he would be charged for corruption.

- Many road contracts were given to a firm Hasnain Construction company without any public tenders by the recently removed Railways and Communication minister General Qazi. The company, owned by a relative of General Pervez Musharraf's son, was also awarded the lease of a lucrative real estate in Lahore for construction of a Golf Course under frontmanship of Palm Country Golf Club, Singapore. The relative of General Musharraf admitted publicly that he was working for a commission to use his contacts and influence for the company.

- Prime commercial land developed in Defence Housing Authority Karachi was leased at dirt heap rates to McDonalds operated by Amin Lakhani by the then Corps Commander, Karachi Lt. General Afzal Janjua.

- The Army's coercive organ NAB struck various under the table deals with various individuals accused of high profile economic crimes in addition to arm twisting NAB defaulters, into joining the present government. These include the present Prime Minister Zafarullah Jamali and at least one fourth of all elected legislators.

You are a slave of the salves. You can stay that way, or not. It's that simple. Nobody is coming to save you. There are no Mohammed bin Qasim from riding to the rescue. Whether you and your children will live as slaves or as free human beings is entirely up to you.

پنجاب یونیورسٹی کا انتہائی نامعقول فیصلہ

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

انٹر کا نتیجہ نکلنے سے پہلے پنجاب یونیورسٹی نے BA/BSc میں داخلہ کے لئے NTS ٹیسٹ منعقد کیا۔ بڑی مہربانی یہ کی کہ وہ ٹیسٹ انٹر کا نتیجہ نکلنے کے تین دن بعد بھی منعقد کر دیا۔ اس ٹیسٹ کے انعقاد کی تشہیر بھی مناسب انداز میں نہ کی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود لاہور شہر کے اکثر طالب علم اس ٹیسٹ میں نہ بیٹھ سکے اور بیرون لاہور کے دور دراز علاقوں کے طالب علم تو اس ٹیسٹ سے بے خبر ہی رہے۔ NTS کی وجہ جواز سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ طالب علموں کو بے جا مشکل میں ڈالا جائے اور امتحانی فیس کے نام سے کروڑوں روپے اکٹھے کئے جائیں۔ اخلاقیات کا تقاضا تو یہ ہے کہ معصوم طالب علموں کے لئے حصول تعلیم کو آسان تو سے آسان بنایا جائے، مگر کیا کیا جائے کہ ہمارے ہاں تو کرپشن سے کوئی ادارہ بھی خالی نہیں رہا۔ جب انٹر کا امتحان بورڈ لے رہا ہے تو اُس کے نتائج کو آگے داخلے میں بنیاد کیوں نہیں بنایا جاتا۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ اُس کی بنیاد پر میرٹ بنے گا تو صرف حقدار ہی داخل ہو سکیں گے لیکن یہ بات نوکر چاہی کے مفاد میں نہیں، کیونکہ اُن کے کم نمبر لینے والے بچے آگے داخلے سے محروم رہ جائیں گے۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے NTS ٹیسٹ مقرر کر دیا گیا ہے جس کی بنا پر انٹر کے امتحان میں شاندار نمبر لینے والوں کو BA/BSc میں داخلے سے محروم کر دیا جائے گا اور من پسند طالب علموں کے لئے داخلے کی گنجائش نکال لی جائے گی۔ FA/FSc کے نتیجہ کو BA/BSc میں داخلے کی بنیاد نہ بنانا سراسر بدنیتی پر مبنی ہے۔ بورڈ کے نتیجہ کو تسلیم نہ کرنا بورڈ پر عدم اعتماد نہیں تو اور کیا ہے؟ حد تو یہ ہے کہ MA/MSc میں داخلہ کے لئے بھی پنجاب یونیورسٹی نے انٹری ٹیسٹ کی شرط لگائی ہے، حالانکہ BA/BSc کا امتحان خود پنجاب یونیورسٹی نے ہی لیا ہے گویا پنجاب یونیورسٹی کو اپنے ہی لئے ہوئے امتحان پر بھی اعتماد نہیں۔ لیکن بات وہی ہے کہ اگر بورڈ اور یونیورسٹی کے نتائج کو آگے داخلے کے لئے بنیاد بنایا جائے تو کرپشن ناممکن ہو جاتی ہے جو کرپٹ لوگوں کو قابل قبول نہیں۔ کیا پاکستان کے ہر شہری کو حصول تعلیم کا حق مساوی نہیں کو مزید ظلم Self Finance کے ذریعے داخلہ ہے۔ جس دولت مند باپ کا بچہ میرٹ پر داخل نہیں ہو سکتا وہ دولت کے بل بوتے پر داخلہ لے لیتا ہے۔ یہ ظلم اس لئے ہے کہ مثال کے طور پر کل سیٹیں 100 ہیں تو یونیورسٹی کے اعلان کے مطابق ان میں سے پندرہ Self finance کی بنیاد پر دولت مندوں کے میرٹ پر پورے نہ اترنے والوں کو دے دی جائیں گی تو میرٹ پر پورے اترنے والے غریب والدین کے پندرہ ہونہار بچے اعلیٰ تعلیم سے محروم رہ جائیں گے۔ کیا اسلام ہمیں اس بے انصافی کی تعلیم دیتا ہے؟ انصاف کا خون کرنے والے یہ فیصلے جنہوں نے کئے ہیں وہ کل کو اللہ کے ہاں اس ظلم کا کیا جواز پیش کریں گے۔ کیا کوئی درد دل رکھنے والا اور انصاف پسند شخص ایسا ہے کہ جو میرٹ کو شفاف اور سادہ رکھنے کے لئے بورڈ اور یونیورسٹی کے امتحانی نتائج کو بنیاد قرار دے اور داخلے کے تمام چور دروازے بند کر کے مستحق طالب علموں کو حق تلفی سے بچا سکے۔ اس سے بورڈ اور یونیورسٹی کے امتحانی نتائج پر اعتماد حاصل ہوگا اور ان امتحانی اداروں کے وقار میں بھی اضافہ ہوگا۔

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے ——— زیر اہتمام

قرآن کالج

191۔ اتاترک بلاک'
نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور
فون: 5833637

علمِ دین اور فکرِ حاضر کے امتزاج کی ایک منفرد کوشش

خصوصیات

عربی اور انگریزی کی پختہ اساس — قرآن کے انقلابی فکر کا تعارف
تفسیر' حدیث اور فقہ کے اصول — اور ان کے ساتھ ساتھ
جدید سیاسیات اور اقتصادیات کا گہرا فہم!

(نوٹ) ایف اے (سال اول) اور بی اے (سال اول) میں داخلے جاری ہیں

ڈاکٹر اسرار احمد
صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
36۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور (فون: 3-5869501)

Vol: 16 Regd. No. LRL -50 No. 33

Weekly Nida-e-Khilafat Lahore

View Point

Abid Ullah Jan

61st year of the slavery of salves in Pakistan

The country marked its 60th anniversary of independence from British rule. People hardly realise that they were in fact celebrating their 60th year of slavery under de facto colonization since the British strategic withdrawal in 1947.

Dictator Gen. Pervez Musharraf and minion Shaukat Aziz, in speeches and appearances celebrating the milestone, praised Pakistan's emergence as a Muslim nation with an important international role, but warned its people they must not succumb to extremism.

They renewed vows not to let any nation publicly violate Pakistan's sovereignty - doesn't matter if they do so without announcing it as they have been doing since October 7, 2001.

Every Pakistani must realise that they are slaves of the slaves.

- Free people can refuse demands for their money, time, children and life. Slaves cannot.
- There is no freedom without the freedom to say "no."
- If someone demands that you do this and you can say "no" and refuse to do it, then you are a free human being.
- If you can be forced to do something or surrender something against your will, you are a slave.

In Pakistan, there is not social support system; no public health coverage; no welfare support. If you are sick and dying and cannot afford treatment, there is no alternative other than rot in your bed and die. If you cannot afford a house, beg and live on streets. At the same time, your little income may not qualify for the income tax, but you pay the government through covert taxes, covert fees, tariffs, excises. In the end you find that you are at more than "half-for-self" versus "half-for-rulers" ratio! Can you say "no" to the confiscation of more than half of your life? Can you even get the masters to reduce the burden.

The puppets that rule you have decided to join the wars of their masters on anyone demanding freedom and the right to self-detrmination to keep the week colonized. Millions of Pakistanis and millions more around the globe, did not want the wars, but the masters started them anyway, by lying to the people. Our puppet leaders joined in the butchery of their own people. Could you refuse the war? Can you refuse being lied to? Could you do anything to the people who sold you to America? Could you save others from illegal detentions in the ISI detention centers?

Our puppet rulers want your children for the future wars of the their masters in London and Washington. Instead of dying in the cause of Allah, they are dying for the cause of America. Can you challenge the generals? Can you stop your children from killing other innocent Pakistanis?

The military regime has been caught lying over and over again to the people, from accepting responsibility for the US bombing of our civilians to removing uniform, to its role in the war on terror to the mystery of disappeared people. For eight years we were told Benazir was corrupt. Now she has been exonerated in the interest of Pakistan (read America). The regime lied that there were foreign militants in Lal Masjid and therefore the massacre of hundreds of innocent boys and girls was justified? Can you refuse to be lied to? Can you punish the liars?

Human rights abuse is rampant in the country. Your loved one disappeared and you don't even know where did they go. You protest against the high handedness of the government agencies and you are harassed and publicly humiliated. Can you stop it?

The same government was the only supporter of the Taliban up until October 7, 2001. Now, simply by declaring a citizen a Talib, or a Taliban sympathiser, the government can lock up Pakistani citizens without a charge and without a lawyer, without a trial in undisclosed locations for as long as it wants.

The government sold your kids to feed modern day torture camps of its masters. It has borrowed billions of dollars, mismanaged and embezzled it, and stuck your coming generations with the payments of interest with loan.

Zakat funds under government control are being looted. Public land is being given out to the military generals in gifts and rewards. One hundred and eleven Army men got 400 plots in Bahawalpur and Rahimyar Khan districts at throwaway prices, paying Rs. 47.50 per kanal (1/8th of a acre) as against the actual price of Rs15,000 to Rs20,000 (1US$=Rs. 56). Another 35,000 kanals were distributed among them.

Six respondents got 400 kanals in the Punjab while former NAB chairman Lt. Gen Mohammad Amjad was allotted a two-kanal plot on the Sarwar Road in Lahore for just Rs. 800,000 - payable in installments over 20 years. The market value of this plot was Rs. 20 million.

Air Chief Marshal Abbas Khattak (retired) received Rs180 million as kickbacks in the purchase of 40 old Mirage fighters. Air Chief Marshal, Farooq Feroz Khan was suspected of receiving a five per cent commission on the purchase of 40 F-7 planes worth $271 million. In 1996, the Army bought 1,047 GS-90s jeeps, at a cost of $20,889 per unit. The market value of a jeep then was only $13,000. According to the National Accountability Bureau (NAB), Pakistan's main accountability organization, some senior Army officers made Rs. 510 million in the deal.

General Pervez Musharraf acquired a commercial plot worth Rs 20 million at DHA in Lahore for just Rs. 100,000, payable in 20 years. "As mentioned in the report of defense services director-general, a loss of Rs 5 billion was incurred due to such allotments."

The Army awarded a contract for the purchase of 1,000 Hino trucks at $40,000 per unit while the local Gandhara Industries had offered trucks of the same specification for $25,000 a piece. In the purchase of 3,000 Land Rover jeeps in 1995, Army officials allegedly received around Rs. 2 billion as kickbacks.

The Army management at WAPDA raised the power tariff 13 times during the last three years besides purchasing electric meters at Rs. 1,050 a piece against the open market price of Rs. 456, causing a loss of Rs 1.65 billion to the national exchequer.

A former military regime sold the Pak-Saudi Fertilizers for Rs. 7 billion and earned a Rs 2 billion commission on the deal.

In 1996, the Pakistan Navy spent Rs. 13 million on installing air-conditioners at the Islamabad Golf Club without any justification.

Some other major scams involving serving or ex members of the military junta are as follows: